نظریۂ جہاد

ایک تنقیدی جائزہ

مولانا عبد العلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ الاقصی





نظریۂ جہاد

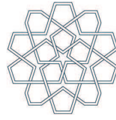


ایک تنقیدی جائزہ



مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

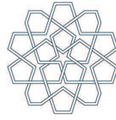
نظریۂ جہاد: ایک تنقیدی جائزہ



عناوین	صفحہ نمبر



”جہاد کیا ہے؟“ کا تنقیدی مطالعہ



مولانا یحییٰ نعمانی صاحب کی کتاب ”الجہاد“ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

> ”اپنی نوعیت کی ایک بالکل نئی کتاب ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد کے موضوع کا ایسا حقیقت پسندانہ گہرا مطالعہ سامنے نہیں آیا تھا۔ کتاب کی اہم خصوصیت عصر حاضر کے تناظر میں جہاد سے متعلق قائم ہونے والے سوالات پر مفصل بحث ہے۔“

ہم چاہتے ہیں اس جدید مطالعہ کو آگے بڑھایا جائے۔ اسی غرض سے بعض مشمولات پر ہم کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ دین میں جہاد کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ دسیوں مقامات سے زیادہ پر جہاد وقتال کا تذکرہ قرآن میں مختلف انداز سے آیا ہے۔ کہیں جنت کا وعدہ اور بلندیٔ درجات کے حوالے سے، کہیں فتح ونصرت کے وعدے سے اور کہیں اس انداز سے کہ ایمان اور نفاق کی کسوٹی جہاد ہے۔ دو سورتوں ”سورۃ الانفال“ اور ”سورۃ التوبہ“ کے سارے مضامین جہاد کے اطراف گھومتے ہیں اور احادیث میں بسا اوقات سب سے افضل اور اعلیٰ درجہ کی نیکی جہاد قرار دیا جاتا ہے اور دنیا میں مسلمانوں کی عزت اور ذلت کو جہاد کو کرنے اور ترک جہاد پر منحصر بتایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ”لغدوۃ فی سبیل اللّٰہ او روحۃ خیر من الدنیا و مافیھا“۔ (متفق علیہ)

یعنی صبح یا شام کو اللہ کی راہ میں ایک بار نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ جہاد کا یہ درجہ بھی بتایا گیا کہ گھر بیٹھ کر ستر سال نمازیں پڑھنے سے افضل یہ ہے کہ آدمی جہاد میں نکلے۔ اور صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ جو پاؤں سفر جہاد میں غبار آلود ہوگا اس کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ جہاد کی فضیلت میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ ”جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ کبھی اس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ جہاد کی آرزو اور تمنا

اس کے دل میں پیدا ہوئی تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرا"۔ "من مات ولم یغز ولم یحدث به نفسه مات علی شعبة من نفاق" (رواہ مسلم)۔ جہاد کی اس اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ شاذ و نادر ہی کوئی تصنیف جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لئے اور شوقِ شہادت پروان چڑھانے کے واسطے منظر عام پر آتی ہو۔ جو بھی اس موضوع پر لکھا یا بولا جاتا ہے وہ صفائی دینے کے لئے اور معذرت خواہانہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اصل جہاد نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ مشہور ہے بعض ملکوں کے تعلیمی اداروں میں جہاد پر مشتمل آیات اور احادیث کو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب کس زمرہ میں آئے گی اور کس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اور اس سلسلہ میں بقول مصنف نہایت محنت و مشقت اور عرق ریزی سے جو کام لیا گیا ہے وہ کس غرض سے کیا گیا ہے؟ اس کا فیصلہ ناظرین کے ذمہ ہے۔ لیکن ہم حسن ظن رکھتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ کتاب اسلامی جہاد پر ایک کاری ضرب ہے تصور جہاد کو اس دور میں بالکل ختم کر دینے کی ایک ناکام کاوش ہے۔ جہاد جو دین اسلام میں ایک بڑی عبادت ہے اور اسلام کا ایک اہم اور مقدس حصہ ہے اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ کبھی یہ کہہ کر کہ اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد اب کوئی ملک دار الحرب نہیں رہا اور کبھی یہ بول کر کہ جہاد مذہبی جبر کے خاتمہ کے لئے مشروع ہوا تھا اور اب مذہبی جبر کا دنیا سے خاتمہ ہو گیا ہے اور کبھی یہ نظریہ پیش کر کے کہ ہر کسی کو اپنے نظریہ کے مطابق آزاد حکومت کرنے کا حق ہے اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا عدل کے خلاف ہے اس طرح کی بوگس نری عقلی اور منطقی دلیلوں کا سہارا لے کر کتاب وسنت کے ٹھوس شواہد کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ رہا غلامی اور جزیہ کا مسئلہ تو یہ ایک پرانی بات ہے جس پر بحث لا حاصل ہے جہاد کے نام سے اس وقت جو سرگرمیاں دنیا میں چل رہی ہیں ان سب کو کنڈم کیا گیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں جہاد کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ پھر پوری کتاب میں جہاد کی تعریف کیا ہے؟ اور جہاد کس کو کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی کہیں نہیں دیا گیا ہے۔ اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ لکھنے اور بولنے والے نہیں بتاتے کہ اصل جہاد کیا ہے بلکہ بات یہاں سے شروع کی جاتی ہے کہ کیا کیا چیزیں جہاد میں داخل ہیں اور پھر جہاد کی اتنی لمبی فہرست سامنے آجاتی ہے کہ اصل جہاد پسِ پردہ چلا جاتا ہے۔ ہمارے کہنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ وہ لمبی چوڑی فہرست غلط ہو جاتی ہے۔ بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دانستہ یا دانستہ اصل جہاد کو چھپایا جاتا ہے اور میدان جہاد میں عملاً جو لوگ مصروف ہوتے ہیں ان کو کنڈم کیا جاتا ہے یا پھر ان کے حامیوں سے اپنے آپ کو باہر بتانا مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہم نہ بنیاد پرست ہیں اور نہ جہادی ہیں۔

جہاد کی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں اور بہت ساری چیزوں کو جہاد میں شامل کیا جاتا ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اصل جہاد وہ ہے جس کا بیان قرآن میں "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ"، "وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ"، "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا" وغیرہ لفظوں میں ہوا ہے۔

اور حدیث میں "لغدوة او روحة فی سبیل اللّٰه" اور "من لم یغز" اور فقہ میں ''جہاد بالسیف'' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اسی جہاد کو اعدائے اسلام نے ہمیشہ اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا ہے۔

مختلف ریاضتوں کے ذریعہ نفس سے جہاد یا جہاد بالقلم وغیرہ پر اغیار نے کبھی یلغار نہیں کی ہے اور نہ انہوں نے اس قسم کے جہادوں سے کسی خطرے کا اظہار کیا ہے۔ الغرض اصل جہاد کفار و مشرکین سے ''قتال'' ہے۔ چنانچہ کتاب و سنت میں لفظ ''قتال'' اور لفظ ''غزوہ'' سے قطعی طور پر یہی مراد ہے۔

نیز قرآن میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے لفظوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ بھی یہی چیز ہے۔ اسی بناء پر فقہائے اسلام نے جہاد کی جو تعریف کی ہے اس سے مسلمانوں کا کفار سے لڑنا ہی جہاد معلوم ہوتا ہے۔

ایک عربی مصنف لکھتے ہیں کہ جہاد کی شرعاً تعریف اصل مذاہب میں سے اکثر کے نزدیک مسلمان کی کافر سے جنگ کے اطراف گھومتی ہے جبکہ کافر کے سامنے اسلام کی دعوت پھر جزیہ کی دعوت پیش کی جا چکی ہو اور اس نے انکار کر دیا ہو چنانچہ فقہ کی کتابوں میں جہاد کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"فعرف فی کتب الحنفی بأنه بذل الوسع والطاقة بالقتال فی سبیل اللّٰه عزوجل بالنفس واللسان او غیر ذلک او المبالغة فی ذلک"

ترجمہ: حنفی کتابوں میں جہاد کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ جہاد وسعت اور طاقت فی سبیل اللہ قتال میں صرف کرنا ہے بذریعہ جان، مال اور زبان وغیرہ۔

نیز

"عرف بأنه الدعاء الی الدین الحق و قتال من لم یقبله"

ترجمہ: جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا اور اس سے جنگ ہے جس نے اس کو قبول نہیں کیا۔

(حاشیہ ردالمحتار، صفحہ: ۱۲۱)

"وفی کتب المالکیة عرف بانه قتال مسلم کافرا غیر ذی عهد لإعلاء کلمة اللّٰه تعالی". (الشرح الصغیر علی اقرب المسلک جلد۲، صفحہ: ۷۶۲)

ترجمہ: فقہ مالکیہ کی کتابوں میں جہاد کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وہ یعنی جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مسلمان کا

ایسے کافر سے جنگ کرنا ہے جس سے کوئی عہد نہ ہو۔

''وفی کتب الحنابلة و شرعا قتال الکفار'' (مطالب اولیٰ)

ترجمہ: یعنی حنبلی کتابوں میں کہا گیا ہے جہاد شرعاً کفار سے جنگ کرنا ہے۔

اسی طرح شوافع کے نزدیک ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے:

''و شرعا بذل الجهد فی قتال الکفار'' (فتح الباری، جلد۶، صفحہ:۳)

ترجمہ: یعنی شرعاً جہاد کفار سے جنگ کرنے میں کوشش صرف کرنا ہے۔

اوپر آپ نے دیکھا کہ مذاہب اربعہ کی کتابوں میں جہاد کی تعریف تقریباً ایک ہی کی گئی ہے اس کے بعد ایک تعریف ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پڑھئے:

''والجهاد بذل الوسع وهو القدرة فی حصول محبوب الحق ودفع مایکرهه الحق''. (مجموع الفتاوی، جلد:۱۰)

ترجمہ: یعنی جہاد وسعت اور طاقت کا صرف کرنا ہے حق تعالیٰ کی محبوب شئی کو حاصل کرنے کے لئے اور اس کو دفع کرنے کے لئے جس کو حق ناپسند کرتا ہے۔

ابن تیمیہؒ نے جہاد کی جو تعریف کی ہے اسے زیادہ جامع کہا جا سکتا ہے لیکن فقہ اربعہ کی کتابوں میں کی ہوئی تعریف کتاب وسنت سے قریب ہے اور قرآن وحدیث سے راست ماخوذ ہے۔

کتاب الجہاد پر مقدمہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب نے لکھا ہے۔ مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کا ذہن بھی جہاد کے مسئلہ میں صاف نہیں ہے مثلاً مولانا کے یہ جملے پڑھئے:

''جو چیز خصوصیت اس کتاب کی ہے وہ اس فی سبیل اللہ ''جنگ'' کا مطالعہ اپنے اس زمانہ کے تناظر میں ہے، جس میں وہ نئے نئے مسائل حل طلب ہو گئے ہیں جن کا کوئی تصور اس وقت نہ تھا جب اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا دارالحرب (یا دارالکفر) اور دارالاسلام کے دو خانوں میں تقسیم تھی۔ اب ہر ملک کی رکنیت اقوام متحدہ کے بعد کوئی ملک نہیں رہ جاتا جسے دارالحرب کہا جا سکے۔ سارے ملک اب ایک عالمی برادری ہیں (جن میں بلاشبہ وہ بھی ہیں جن پر صادق کہ ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی!'') مگر عالمی برادری کے نظام نے خواہی نہ خواہی سب کو اس نظام کے اصولوں کا پابند بنالیا ہے۔''

اس عبارت سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک اب اس زمانہ میں اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد کوئی ملک دارالحرب نہیں ہے ظاہر ہے جب کوئی ملک دارالحرب نہیں ہے تو جہاد کا بھی سوال ختم ہے اور جہاد وقتال سے متعلق قرآنی آیات واحادیث بے محل ہو کر رہ جائیں گی اور بات وہی ہوئی جو قادیانیوں اور

بہائیوں نے کہی تھی کہ انگریز بہادر کی قلمرو میں جہاد منسوخ ہے۔

یہ ایک ناسمجھی ہی نہیں بلکہ ایک بڑی گمراہی ہے جس میں اچھے خاصے لوگ مبتلا ہیں جس کے نتیجہ میں وہ سارا نقشہ جو آج کے دور میں اسلام کے تئیں لوگ بناتے ہیں قرآن وسنت سے دور ہو جاتا ہے اور کتاب وسنت کے نصوص کی جو تشریح اور تعبیر کرتے ہیں وہ غلط ہو جاتی ہے۔

اس گمراہی کی دو وجہ ہے ایک تو یہ ہے کہ ہمارے علماء اس دور میں زیر کفر وشرک رہنے کے لئے وجہ جواز کے دلائل کتاب وسنت میں ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بڑا عالم وہ مانا جاتا ہے جو کتاب وسنت سے بھی ایسے مسائل ڈھونڈ نکالے جن سے کمیونزم، سوشلزم اور سیکولرزم کے زیر اقتدار سکون سے رہنے کے لئے جواز نکل سکے۔ ظاہر ہے قرآن وسنت میں اس کے دلائل نہیں مل سکتے ہیں کیونکہ اللہ اور رسول کو شیطان اور اولیاء شیطان کا غلام بن کر سکون سے رہنا پسند نہیں ہے۔ نمرود، فرعون، ابوجہل اور ابولہب سے لڑنا پسند ہے ان سے دوستی اور محبت کا سوال نہیں چہ جائیکہ ان کی غلامی کو قبول کرے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوہ اور ان کی تعلیمات غیر اللہ کی اطاعت اور غلامی کو قبول کرنا ایک لمحہ کے لئے روا نہیں رکھتے ہیں اس لئے شیطان نے سکھایا کہ اسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے متعلقات کو ایک نئی شکل دی جائے اور ان کی اصل توجیہ کے علاوہ نئی توجیہ پیش کی جائے تاکہ مسلمان غیروں کی غلامی کو ناپسند نہ کریں۔

دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور اس دور میں کالعدم بتانا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس گمراہی کی دوسری وجہ یہ خیال ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات حالات کے تناظر میں وضع کی گئی ہیں یہ بات سراسر غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ کچھ قرآنی حقائق کے اظہار کے لئے یہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں جیسا کہ آگے ہم بتائیں گے۔

اس مقام پر سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اصطلاح کیا چیز ہوتی ہے۔

اردو لغت میں ہے اصطلاح 'مونث'' کسی علمی یا فنی گروہ کا کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ کوئی مفہوم مقرر کر لینا۔ عربی لغت میں بھی اصطلاح کے یہی معنی بتائے گئے ہیں۔ المنجد میں ہے: الاصطلاح۔ جمع۔ اصطلاحات۔

''العرف الخاص ای اتفاق طائفة مخصوصة من القوم علی وضع الشئ او الکلمة''۔

یعنی اصطلاح کہتے ہیں خاص عرف کو یعنی کسی قوم یا جماعت کا کسی لفظ اور کلمہ کے معنی پر اتفاق کر لینا جو

اصل معنی کے علاوہ ہو۔ مثال کے طور پر کلمہ کے لفظ کو لیجئے، ہماری عام زبان میں اس لفظ کو بول کر جو سمجھا جاتا ہے علم نحو میں اس کے برخلاف سمجھا جاتا ہے چنانچہ ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' کو عام طور سے کلمہ کہا جاتا ہے لیکن نحویوں کے نزدیک کلمہ نہیں بلکہ کلام ہے۔ نحویوں کے نزدیک کلمہ کی تعریف کچھ اور ہے اور صرفیوں کے نزدیک کچھ اور۔

لفظ ''صلاۃ'' کے لغوی معنی دعا کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں کچھ مخصوص افعال کے مجموعہ کو صلاۃ کہتے ہیں۔ اس بات کا لحاظ نہ کرکے بعض ہندوستانی دانشوروں نے کہا کہ لفظ صلاۃ کا اطلاق جس طرح مسلمانوں کی عبادت پر ہوتا ہے اسی طرح گرجا میں کرسچین اور مندر میں ہندو کی عبادت پر بھی صلاۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔ نہیں معلوم اس طرح کا دھوکہ بے خبری میں کھایا اور کھلایا جارہا ہے یا دانستہ طور پر۔ بہر حال ایسا ہی معاملہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات کے ساتھ کیا جارہا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ اصطلاحات منصوص ہیں یا غیر منصوص۔

بہر صورت اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دونوں اصطلاحیں فقہاء اسلام نے بکثرت استعمال کی ہیں۔ اس لیے محض لفظی اشتراک کی بنا پر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان اصطلاحوں کو اپنا معنی پہنائے۔ ہر کسی کو اختیار ہے کہ وہ کوئی اصطلاح بنائے اور اس کے ساتھ کوئی مخصوص معنی وابستہ کرے۔ لیکن فقہاء کی اصطلاحوں کے ساتھ تو وہی معانی اور مفہوم وابستہ ہوں گے جن کے معنی اور مفہوم کے لیے انھوں نے یہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اس حقیقت کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کرکے کئی لوگ دارالاسلام اور دارالحرب کے وزن پر دارالمسلمین، دارالتبلیغ اور دارالدعوۃ کے الفاظ بول کر فقہاء کی اصطلاحات کے اطلاق کی نفی کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو یا تو انتہائی بے خبری اور لاعلمی کا نتیجہ ہے یا کھلا ہوا فریب ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ دارالاسلام ہو کہ دارالحرب، دعوت وتبلیغ کا کام تو ہر جگہ کرنا فرض ہے۔ دارالتبلیغ اور دارالدعوۃ کہہ کر دارالاسلام اور دارالحرب کی نفی نہیں کی جاسکتی۔

فقہاء اسلام نے یہ اصطلاحات قرآن وسنت سے ثابت شدہ بعض حقائق کی تعبیر کرنے کے لئے استعمال کی ہیں۔ وہ حقائق جب تک ثابت اور قائم رہیں گے اس وقت تک ان اصطلاحات کا اطلاق باقی رہے گا اور اگر بالفرض کوئی شخص ان اصطلاحات کو کسی وجہ سے چھوڑنا چاہتا ہے تو چھوڑ دے۔ لیکن قرآن وسنت سے ثابت شدہ ان حقائق کو تو چھوڑا نہیں جاسکتا جو ان اصطلاحوں کے پس منظر میں ہیں۔ دوسری بات اس ضمن میں یہ ہے کہ ان اصطلاحوں کو چھوڑا تو جاسکتا ہے کہ یہ قرآن اور سنت کی اصطلاح نہیں ہیں۔ لیکن ان کو وہ معنی نہیں پہنائے جاسکتے جو واضعین اصطلاحات کے مفہوم اور معنی کے خلاف ہوں۔ بنابریں یہ اصطلاحات اب بھی قابل اطلاق ہیں۔ ناقابل اطلاق ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے نیز ان کی تعریف آج کے حالات میں بھی وہی رہے گی جو پہلے تھی۔ موجودہ حالات اگرچہ زمانہ ماضی کے حالات کے علاوہ ہیں مگر حالات بدلے ہیں حقائق نہیں بدلے ہیں، حالات

چاہے کچھ ہو جائیں مگر سچائی اپنی جگہ سچائی رہے گی اور جھوٹ اپنی جگہ جھوٹ ہی رہے گا۔ ایمان، اسلام، کفر، شرک اور نفاق کی وہی تعریف رہے گی جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھی۔ حالات کی تبدیلی سے ان کی تعریف میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ اسی طرح وہ قرآنی مفہوم اور حقائق بھی بدلنے والے نہیں ہیں جن کی تعبیر ان اصطلاحوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ مفہوم اور حقائق کیا ہیں جن کو بتانے کے لئے یہ اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں فقہاء کی تصریحات پیش کرنے سے پہلے ہم قرآن وسنت کی روشنی میں اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے دوسرے دو سوالوں کا جواب ہمیں معلوم کرنا ہوگا۔ اس جواب سے وہ مفہوم اور حقائق معلوم ہو جائیں گے جن کی تعبیر کے لئے دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح وضع کی گئی۔

پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن میں کفار سے جنگ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ کیا حکم ہے فرض ہے یا محض جائز؟

دوسرا سوال ہے کہ جنگ اور قتال کی وجہ کیا ہے؟

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ" (البقرہ: آیت ۲۱۶)۔ "وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ...وَاقْتُلُوْهُمْ" (البقرہ: ۱۹۰-۱۹۱)۔ سورۃ التوبۃ کی آیات (۲۹، ۳۶، ۳۸، ۱۲۱) وغیرہ آیات سے استدلال کرتے ہوئے فقہاء امت نے مشرکین کے ساتھ جہاد بمعنی قتال کو فرض کہا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے ساتھ احادیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

مثلاً یہ حدیث "امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دمائھم واموالھم إلا بحق الاسلام وحسابھم علی اللّٰہ" (متفق علیہ)

فقہاء کی ایک قابل لحاظ تعداد نے جہاد کو فرض عین بتایا ہے اور بڑی اکثریت نے فرض کفایہ کہا ہے۔ لیکن فرض کفایہ کہنے والوں کے نزدیک بھی کئی صورتوں میں فرض عین ہو جاتا ہے اس حکم کی تاریخ اور حیثیت دونوں جاننے کے لئے ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند الفاظ کافی ہیں۔

"ثم فرض علیھم قتال المشرکین کافۃ و کان محرما ثم مأموراً بہ لمن بدأ بالقتال ثم مأموراً بہ لجمیع المشرکین۔"

پھر ان پر تمام مشرکین سے جنگ کرنا فرض کر دیا گیا اور پہلے جنگ حرام تھی، پھر اس کی اجازت دی گئی پھر اُس سے لڑنے کا حکم دیا گیا جو لڑائی کا آغاز کرے۔ پھر تمام مشرکین سے لڑائی کا حکم دیا گیا۔

(زادالمعاد، صفحہ: ۶۵، جلد: ۲)

اوپر ہم نے اشارۃً کئی آیات قرآنی کا حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک آیت پر خاص طور پر غور کیجئے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ○ (التوبة:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں ان اہل کتاب سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے اندر تین باتیں پائی جاتی ہیں:

① اللہ پر اور آخرت پر صحیح معنی میں ایمان نہ ہو۔

② تحلیل و تحریم کا حق صرف اللہ کے لئے تسلیم نہ کرتے ہوں اور اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی قانون سازی کا اختیار دیتے ہوں۔

③ دین حق یعنی اسلام کو اپنا دین یعنی طریق زندگی نہ بتاتے ہوں۔

ان صفات پر جب تک وہ قائم ہیں اس وقت تک قتال کرنا فرض ہے، اِلاَّ یہ کہ وہ جزیہ دینے کے لئے اور چھوٹے اور ماتحت بن کر رہنے کے لئے تیار ہوجائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے جن ممالک کے لوگوں کے اندر یہ صفات پائی جائیں گی۔ ان ملکوں سے قتال کرنا فرض ہے۔ اس طرح صرف ایک آیت سے حکم قتال کی وجہ اور علت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ حکم صرف اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام مشرکین کے لئے ہے۔ اہل کتاب کے اندر کسی بھی معنی میں ایمان نام کی چیز تو ہوتی ہے اس کے بعد بھی ان پر حکم لاگو ہوتا ہے تو جن مشرکین کا ایمان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو ان پر تو یہ حکم بدرجہ اولیٰ لاگو ہونا چاہئے۔ البتہ اس مقام پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ مشرکین عرب سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا وہ اس عام حکم سے مستثنیٰ ہیں ان کے لئے صرف دو ہی آپشن ہیں یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جنگ کے لئے اور قتل ہونے کے لئے تیار رہیں جیسا کہ اسلامی تاریخ سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے یہ ملک حجاز کی خصوصیت ہے۔ اس پس منظر میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین عرب سے جنگ کرنے کا سبب اور علت محض کفر ہے یعنی اگر وہ حجاز میں بے ضرر بن کر رہنا چاہیں اور جزیہ بھی دینے کے لئے تیار ہوں تو بھی انہیں وہاں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ چنانچہ دور اول میں اس پر عمل ہو چکا ہے۔

عرب کے علاوہ زمین کے دوسرے علاقوں میں مشرکین اسلام کی ماتحتی میں رہنا چاہیں اور جزیہ ادا کریں تو

انہیں ایک حد تک آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ المغنی لابن قدامہ کی تصریح کے مطابق حنبلی اور شافعی مذہب میں جزیہ صرف اہل کتاب اور مجوسی سے لیا جائے گا بقیہ سارے بت پرستوں کے لئے محض دو ہی راستے ہیں۔ ایمان یا جنگ۔ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت ہے کہ عرب کے بت پرستوں کے سواء تمام کفار سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے اور یہی مذہب حنفیہ کا بھی ہے۔ ان تمام رایوں اور مذاہب کا ماخذ "حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ" والی آیت ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمین کے کسی خطہ میں کفر کی بالا دستی کسی طرح برداشت نہیں کی جائے گی اور حجاز میں کفر کا وجود بھی نا قابل برداشت ہے۔ حجاز میں کفر کے وجود کو ختم کرنا اور بقیہ ساری دنیا میں کفر اور اہل کفر کی بالا دستی کو ختم کرنا حکم جہاد و قتال کا مقصود ہے۔

یہ قرآنی حقائق ہیں ان کی روشنی میں ملکوں کی تقسیم کی جائے تو ایک ملک وہ ہوگا کہ جو ایسے لوگوں کے زیر اقتدار ہو۔

① جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور

② قانون سازی کا حق اصلاً اللہ کو دیتے ہوں اور

③ اسلام کو اپنا دین یعنی اپنا نظام زندگی مانتے ہوں۔

اور دوسرا ملک وہ ہوگا جس کے حکمراں ان تینوں صفات سے یا ان میں سے دو سے یا ایک صفت سے عاری ہوں۔ روئے زمین کے تمام ملکوں کو ان دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ملکوں کی یہی دو قسمیں ہوسکتی ہیں تیسری قسم نہیں ہوسکتی۔ جس طرح تمام انسانوں کی دو ہی تقسیم ہوسکتی ہے، ایک خدا کے فرمانبردار و مسلم بندے۔ دوسرے خدا کے نافرمان کافر لوگ۔ اس کے علاوہ تیسری قسم نہیں ہے اور جس طرح تمام مسلم کی کوئی تقسیم نہیں کی جاسکتی اسی طرح پہلے قسم کے ملک کی بھی کوئی دوسری قسم نہیں ہوسکتی۔ اور جس طرح نافرمانوں کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں کافر، مشرک اور منافق وغیرہ اسی طرح دوسری قسم کے ملک کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں دارالحرب، دارالامان، دارالمسالمہ وغیرہ، اور جس طرح کافر، مشرک اور منافق مختلف ناموں کے باوجود باعتبار حقیقت ایک ہیں اسی طرح دارالحرب و دارالکفر، دارالامن اور دارالمسالمہ وغیرہ بھی اپنی حقیقت کے لحاظ سے ایک ہیں۔

ہماری اس گفتگو کی روشنی میں اس ملک کی تعریف اور نشاندہی بآسانی کی جاسکتی ہے جس سے جنگ نہیں کی جاسکتی اور جس سے جہاد کرنا فرض ہے۔ پہلے کی تعبیر فقہاء نے دارالاسلام سے اور دوسرے کی تعبیر دارالحرب یا دارالکفر کی اصطلاح سے کی ہے۔ اوپر کی گفتگو سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ جہاد کی وجہ اور سبب کفر ہے یا

غلبۂ کفر، یعنی ملک حجاز میں حکم جہاد کا سبب محض کفر کا پایا جانا ہے اور زمین کے دوسرے خطوں میں غلبۂ کفر ہے، حجاز میں جہاد کا مقصد کفر کو ختم کرنا ہے اور دوسری جگہوں میں جہاد کی غرض غلبۂ کفر کو ختم کرنا ہے اس طرح فقہاء کا دارالحرب اور دارالکفر کو بطور مترادف استعمال کرنا بھی سمجھ میں آتا ہے۔

ہمارے موضوع سے متعلق ایک عرب عالم ڈاکٹر علی بن نفیع العلیانی نے ایک مقام پر اچھی گفتگو کی ہے ان کی گفتگو کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔ مستشرقین اور ان کے تلامذہ جن مسائل میں علم کے بغیر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں ان میں ایک مسئلہ دارالحرب و دارالکفر کا بھی ہے، جن ملکوں کی مسلمانوں سے عملاً جنگ جاری ہے انہیں کو یہ لوگ دارالحرب والکفر کہتے ہیں اور جن کافر ملکوں سے جنگ نہیں ہے اور مسلمانوں سے ان کا کوئی معاہدہ بھی نہ ہو ان کو دارالحرب والکفر نہیں مانتے، ان کی رائے کے مطابق امریکہ اور روس دارالحرب نہیں ہیں کہ ان ملکوں میں مسلمان امن سے رہتے ہیں۔ اسرائیل سے کوئی معاہدہ ہوجائے تو پھر دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں رہ جائے گا جس سے جنگ مسلمانوں کے لئے ضروری قرار پائے! حالانکہ علماء اسلام نے دارالکفر اس ملک کو قرار دیا ہے جس میں کفریہ احکام کو غلبہ حاصل ہو اور دارالاسلام ان کے نزدیک وہ ملک ہے جس میں احکام اسلامی کو غلبہ ہو جس میں چاہے مسلمان نہ ہوں صرف ذمی لوگ ہوں اور مسلمانوں کا کوئی حاکم احکام اسلامی جاری کرنے کے لئے مقرر ہو۔ چنانچہ قاضی ابویعلیٰؒ کہتے ہیں کہ جس ملک میں اسلام کے بجائے احکام کفر کو غلبہ حاصل ہو وہ دارالکفر ہے اور کشاف القناع میں ہے کہ اس شخص پر ہجرت واجب ہے جو دارالحرب میں اپنے دین کا اظہار نہ کرسکے اور دارالحرب وہ ہے جس میں کفر کا حکم غالب ہو۔ دارالکفر والحرب سے مسلمان کبھی کسی معاہدہ کی وجہ سے یا اپنی کمزوری کی بنا پر جنگ سے توقف کرتے ہیں لیکن اس توقف کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ کفار کے ملک کو دارالحرب والکفر نہیں کہیں گے کیونکہ ملک فارس اور روم اس وقت بھی دارالکفر اور دارالحرب تھے جبکہ آنحضور ﷺ نے ان ملکوں کو اپنی فوج نہیں بھیجی تھی اور جبکہ ان کی طرف سے مسلمان کے حق میں کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہورہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ ملک جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے قانون کا تابع ہو وہ دارالحرب اور دارالکفر ہے اگرچہ مسلمانوں سے ان کا کوئی معاہدہ ہوجائے، جیسے مکہ صلح حدیبیہ کے بعد تھا۔

شیخ حسن ایوب کہتے ہیں:

> ''ذمیوں کا ملک بھی دارالاسلام کہلاتا ہے کیونکہ اس کا حاکم مسلمان ہوتا ہے جو ان پر دین اسلام کے عام احکام نافذ کرتا ہے اور وہ اسلام کے زیر نگیں ہے برخلاف اس ملک کے جس سے مسلمانوں کی صلح ہوگئی ہو وہ بہرصورت دارالحرب ہوگا، جیسے صلح حدیبیہ کے بعد مکہ تھا کہ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ مخالف تھا۔ اس مقام پر خیبر کے واقعہ کو دیکھئے۔ خیبر کو فتح کرنے کے بعد ایک مسلمان گورنر آپ نے مقرر کردیا۔ جو احکام

اسلامی جاری کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک پر مسلمانوں کا مقرر کیا ہوا والی اسلامی احکام کے مطابق کام کرتا ہے تو وہ ملک دارالاسلام کہا جائے گا چاہے اس کے باشندے غیر مسلم ہوں۔ (بحوالہ اہمیۃ الجہاد)

علامہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب "**المحلی**" میں لکھا ہے اہل ذمہ اپنے شہروں میں رہتے ہوں اور ان کے علاوہ دوسرے نہ ہوں۔ ایسی صورت میں کوئی مسلمان ان کے ساتھ بحیثیت امیر یا تاجر وہاں جا کر رہے تو نہ اس کو کافر کہیں گے اور نہ گنہگار۔ بلکہ وہ پکا مسلمان ہوگا۔ اور اس ملک کو دارالاسلام کہیں گے نہ کہ دارالشرک، اس لئے کہ دار کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے جو وہاں غالب ہو حاکم ہو اور مالک ہو۔ چنانچہ کوئی کافر دارالاسلام کے کسی حصہ پر غالب ہو جائے اور مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے لیکن وہی مالک ہو اور وہی اس کا نظم چلانے کا تنہا ذمہ دار ہو اور علی الاعلان اسلام کے سواء کسی دوسرے دین کا اقرار کرتا ہو تو جو کوئی اس کا تعاون کرے گا اور اس کے ساتھ رہے گا اسے انہیں میں شمار کیا جائے گا اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔

تاریخ کا یہ واقعہ بھی ہے کہ بنی عبید قداح نے جب شام اور مصر میں حکومت قائم کی۔ جمعہ اور جماعت قائم کی، قاضی اور مفتی مقرر کیا اور عام شرائع اسلام کو رواج دیا لیکن اسی کے ساتھ شریعت کی کئی باتوں کی مخالفت کی، اور ان کی طرف سے شرکیہ افعال کا مظاہرہ ہوا اور اس طرح ان کا نفاق کھل گیا تو اہل علم کا ان کے کافر ہونے اور ان کے علاقہ کے دارالحرب پر اتفاق ہوگیا یہاں تک کہ بعض معروف اور معتبر لوگوں نے کہا کہ اگر میرے دس تیر ہوں تو ایک تیر صلیبی فرنگیوں پر چلاؤں گا اور نو تیر بنی عبید پر۔ سلطان محمود زنگیؒ نے جب ان پر فوج کشی کر کے مصر کو ان سے چھین لیا تو مسلمان بہت خوش ہوئے۔

علّامہ ابن جوزیؒ نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور دیگر کئی علماء نے کتابیں لکھیں اور ان کے کفر کو بتایا۔ باوجود اس کے کہ اسلام کے کئی ظاہری احکام پر وہ عمل پیرا تھے۔ یہ واقعہ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے "**الدرر السنیۃ**" میں تحریر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بنی عبید کی حکومت کو دارالحرب قرار دیا باوجود اس کے کہ وہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد امن کے ساتھ رہ رہی تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ میں کافر حکومتوں میں مسلمان امن وچین سے رہتے ہیں اور حکومتوں کے کافرانہ نظم ونسق ان سے تعرض نہیں کرتے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی عبید کے ملک کو دارالحرب کہا گیا اور آج کفار کے شہروں کو دارالحرب کیوں نہیں کہا جاتا؟! دراصل بات یہ ہے کہ مستشرقین اور استعمار پسندوں نے دارالکفر والحرب کا مفہوم بدلنے کی کوشش کی ہے اور کفار کے محکوم اور مغلوب مسلمانوں کے احساس اور شعور کو سلا دینا چاہا ہے تاکہ وہ یہ باور کریں کہ وہ جن ملکوں میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں وہ دارالاسلام ہیں نہ کہ دارالکفر۔ کیونکہ جب ان کے اندر یہ شعور جاگ اٹھے کہ وہ جن ممالک میں

رہتے ہیں وہ دارالکفر ہیں تو لازماً گھٹن محسوس کریں گے اوران ملکوں کو دارالاسلام بنانے کے لئے کوشاں ہوں گے مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں کی یہ کوشش بھی رہی ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال جاں گزیں کریں کہ دیار کفار میں جب تک انہیں امن میسر ہے اس وقت تک وہ دارالاسلام ہیں۔ چنانچہ ایک ہندی عالم مولوی کرامت علی نے انگریزی دور حکومت میں لکھا کہ

> ''ہندوستان دارالاسلام ہے اور دارالاسلام میں جہاد جائز نہیں اور اگر کوئی انگریز حکومت کی مخالفت کرے گا تو وہ باغی قرار پائے گا اور ایسے باغیوں کی سرکوبی کرنا اور حکومت کی تائید کرنا مسلمانوں کا فرض ہوگا۔''

مولانا کرامت علی مستشرقین سے متاثر تھے۔

ایک اور عربی عالم استاذ عبداللہ احمد القادری کے چند جملے یہاں پیش کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں۔ موصوف نے قرآن کی چند آیات پیش کر کے کہا کہ ان آیات سے صاف طور سے ایک ایسا پیمانہ سامنے آتا ہے جس کے مطابق ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دارالاسلام کیا ہے اور دارالکفر کیا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں یہ ایک عام قاعدہ کلیہ معلوم ہوتا ہے کہ دارالاسلام وہ سرزمین ہے جس میں اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کا غلبہ ہو، معروف کا حکم دیا جاتا ہو اور منکر سے روکا جاتا ہو۔ اور دارالکفر وہ سرزمین ہے جس میں ظلم کا دور دورہ ہو اور سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ غیروں کو شریک کرنا اور قانون سازی اور تحلیل وتحریم کا حق غیروں کو دینا ہے۔

(حقیقۃ الجہاد فی سبیل اللہ)

فقہاء کی تصریحات

زیر بحث مسئلہ میں عام طور پر جو الجھن پیدا ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ فقہی عبارتوں کو صحیح طور سے نہ سمجھنا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے **"تحذیر الاخوان عن الربو"** میں اس جانب اپنے ان جملوں میں اشارہ فرمایا۔

> ''تعجب کرتا ہوں فقہاء وقت سے کہ اس شرط پر کس طرح غلطی کرتے ہیں پورا مطلب نہیں سمجھتے کہ کیا ہے؟!
> علامہ کا ایک اور جملہ ہے کہ ''تنوع عبارات فقہاء دیکھ کر اور اصل مطلب کو نہ سمجھ کر شبہ ہوتا ہے اور بعد فہم مطلب اہل مذہب کے امر واضح ہے۔''

ہمارے خیال میں مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اصل مسئلہ کیا ہے وہ کیا سوالات ہیں جن کے جواب مطلوب ہیں۔ فقہاء اسلام نے مختلف سوالات کو سامنے رکھ کر مختلف باتیں لکھی ہیں۔ بسا اوقات لوگ ایک سوال کا جواب دوسرے سوال کے جواب میں پیش کرتے ہیں جن کے نتیجہ میں خلط مبحث

ہوجاتا ہے اور بات میں الجھاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھئے کہ چار سوالات ہیں جن کے جواب آپ کو معلوم کرنے ہیں۔

① دارالاسلام کس کو کہتے ہیں؟
② دارالحرب یا دارالکفر کس کو کہتے ہیں؟
③ کوئی دارالحرب کب دارالاسلام بن جائے گا؟
④ کوئی دارالاسلام کب دارالحرب بن جائے گا؟

اب ہم بالترتیب ان سوالوں کا جواب فقہاء کی تصریحات کی صورت میں دیں گے۔

● **سوال نمبر ۱: کا جواب:**

"ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیھا حکم امام المسلمین وتکون تحت قھرہ"۔ ("کافی" فی فقہ اھل المدینۃ)

ترجمہ: بیشک دارالاسلام سے مراد ایسے شہر ہیں جن میں امام المسلمین کا حکم چلتا ہو اور وہ امام المسلمین کے زیر اقتدار ہو۔

"لان الموضع الذی لایامن فیہ المسلمون من جملۃ دارالحرب فان دار الاسلام اسم للموضع الذی یکون تحت ید المسلمین وعلامۃ ذالک ان یامن فیہ المسلمون۔" (شرح السیر الکبیر، جلد۳، صفحہ:۸۱)

ترجمہ: کیونکہ وہ جگہ جس میں مسلمان محفوظ نہ ہوں من جملہ دارالحرب ہے، اس لئے کہ دارالاسلام اس مقام کا نام ہے جو مسلمانوں کے زیر نگیں ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہاں مسلمان محفوظ ہوں۔

علامہ السرخسیؒ المبسوط میں فرماتے ہیں کہ:

"ان الامام اذا فتح بلدۃ وصیرھا دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیھا فانہ یجوز لہ ان یقسم الغنائم فیھا"۔

ترجمہ: بیشک امام جب کسی شہر کو فتح کرے اور اس کو احکام اسلام جاری کر کے دارالاسلام بنالے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ وہاں مال غنیمت تقسیم کرے۔

یہ قدیم فقہاء کی تعریفات ہیں ابھی حال میں فقہی انسائیکلو پیڈیا "**الموسوعۃ الفقھیۃ**" جو کویت میں تیار کی گئی ہے اس میں دارالاسلام کی تعریف "**المبسوط**"، "**کشاف القناع**"، "**الانصاف**" اور "**المدونہ**" کے حوالہ کے ساتھ صرف ایک جملہ میں یوں کی گئی ہے:

"دار الاسلام هی کل بقعة تکون فیها احکام اسلام ظاهرة"

ترجمہ: دارالاسلام وہ خطہ ارض ہے جس میں اسلامی احکام غالب ہوں۔

بیسویں صدی کے علماء میں سے بھی چند کی تصریحات ملاحظہ فرمایئے:

مصر کے مشہور عالم ابوزہرہ فرماتے ہیں:

''دارالاسلام ہر وہ حکومت ہے جو سلطان المسلمین کے ذریعہ چلائی جائے اور پورا اختیار اور قوت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، یہی وہ ادارہ ہے جس کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہے اور جس کے لئے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔'' (بحوالہ العلاقات الدولیة فی الاسلام)

عبدالقادر عودہؒ کہتے ہیں:

''وہ سب شہر دارالاسلام ہیں جن میں اسلام کے احکام غالب ہوں یا ان کے مسلمان باشندے اسلامی احکام غالب کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں، پس دارالاسلام میں ہر وہ شہر داخل ہے جس کے تمام باشندے یا اکثریت مسلمان ہوں اور وہ شہر بھی جس پر مسلمان قابض اور حکمراں ہوں چاہے اس کے اکثر باشندے غیر مسلم ہوں۔'' (بحوالہ سابق)

● سوال نمبر: ② کا جواب:

مذہب حنبلی کی ایک اہم کتاب "الانصاف" میں دارالحــرب کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے

"دار الحرب ما یغلب فیها حکم الکفر" دارالحرب وہ ہے جس میں کفر کا حکم غالب ہو۔

المعتمد فی اصول الدین لابی یعلی میں ہے:

"کل دار کانت الغلبة فیها لاحکام الکفر دون احکام الاسلام فهی دار الکفر"۔

ترجمہ: ہر وہ دار جس میں احکام اسلام کے بجائے احکام کفر کو غلبہ حاصل ہو وہ دارالکفر ہے۔

"**کشاف القناع**" میں ہے

"وتجب الهجرة علی من یعجز عن اظهار دینه بدار الحرب وهی ما یغلب فیها حکم الکفر"۔

ترجمہ: اور اس شخص پر ہجرت واجب ہے جو دارالحرب میں اپنا دین ظاہر کرنے سے عاجز ہو کفر کے احکام غالب ہوں۔

"دار الحرب هی کل بقعة تکون احکام الکفر فیها ظاهرة" دارالحرب ہر وہ خطۂ زمین ہے

جس میں کفر کے احکام غالب ہوں۔

علامہ رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی دارالحرب کی تعریف ایک جملہ میں یوں فرمائی ہے:

''دارالحرب وہ ہے کہ حاکم متصرف اس کا کافر ہو جیسا تمام کفار کے ممالک میں ہوتا ہے۔''

● **تیسرے سوال کا جواب کہ کوئی دارالحرب کب دارالاسلام بن جائے گا؟ بدائع الصَّنائع میں ہے:**

''لا خلاف بین اصحابنا فی ان دار الکفر تصیر دار الاسلام بظھور احکام الاسلام فیھا۔'' (عالمگیری، جلد: ۳، صفحہ: ۱۴۶)

ترجمہ: ہمارے اصحاب کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ دارالکفر دارالاسلام بن جائے گا، احکام اسلام کے اس میں غالب ہونے سے۔

''اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وھو اظھار حکم الاسلام فیھا۔''

ترجمہ: یعنی جان لو کہ دارالحرب محض ایک شرط سے دارالاسلام بن جائے گا اور وہ ہے اسلامی حکم ''قانون'' کا غلبہ اور نفاذ۔

السیر الکبیر، جلد: ۴، صفحہ ۳۰۲ پر ہے:

''لان الدار انما تصیر دار الاسلام باجراء حکم المسلمین فیھا''

ترجمہ: کیونکہ دار، دارالاسلام صرف مسلمانوں کے قانون کے اجراء سے بن جاتا ہے۔

● **چوتھے سوال کا جواب کہ کوئی دارالاسلام کب دارالحرب بن جائے گا؟**

اس سوال کا جواب امام محمدؒ اور امام یوسفؒ یہ دیتے ہیں کہ جس طرح دارالحرب محض احکام اسلام کے اجراء اور اظہار سے دارالاسلام بن جاتا ہے اسی طرح کوئی دارالاسلام بھی محض احکام کفر کے اجراء اور اظہار سے دارالحرب ہو جائے گا، لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے تین شرطیں ہیں:

① احکام کفر کا غلبہ۔

② دارالکفر سے ملا ہوا ہونا۔

③ یہ کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی سابق امان کے ساتھ مامون نہ ہو۔

اس مقام پر یہ نکتہ خاص طور سے اپنے سامنے رکھئے کہ پہلے دوسرے اور تیسرے سوال میں کوئی اختلاف نہیں ہے صرف چوتھے سوال کے جواب میں اختلاف ہے اور وہ اختلاف بھی بنیادی اختلاف نہیں ہے بلکہ بات

یہ ہے کہ احکام کفر کا غلبہ ہی ہر ایک کے نزدیک اصل ہے مگر یہ سوال کہ کس غلبہ کا اعتبار کیا جائے اور کب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب کفر کا غلبہ مستقل ہوگیا ہے، اس میں اختلاف ہے، گویا امام صاحب نے غلبہ کے استحکام کے لئے دو مزید شرطیں لگائی ہیں۔ اس طرح پورا مسئلہ بالکل واضح ہے اور تقریباً متفق علیہ ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم نے جو گفتگو کی ہے اس میں اس سوال کا جواب آ گیا ہے پھر بھی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی ملک جو دارالاسلام نہیں ہے یعنی جہاں اللہ کا حکم چلانے کے بجائے کفر کا حکم چلایا جارہا ہو، اقتدارِ اعلیٰ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا تسلیم کیا جاتا ہو، قرآن وسنت کو قانون کا ماخذ نہ بنایا جارہا ہو۔ اس کو سورۃ التوبۃ آیت ﴿۲۹﴾ کے بموجب اسلام کے ماتحت بنانے کی کوشش کرنا مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے۔ فقہی زبان میں یہ کہا جائے گا کہ اس کو دارالاسلام بنانا فرض ہے اور اس کے واسطے حسب استطاعت جو کچھ کیا جاسکتا ہے اس میں جہاد بالسیف بھی داخل ہے۔ مسلمانوں کی ذمہ داری اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جبکہ کسی دارالاسلام کو کفار نے دارالحرب بنالیا ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں۔ کسی ملک کو دارالاسلام بنانے کے لئے ساری جدوجہد حتیٰ کہ جہاد بالسیف ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہوئے کی گئی ہے۔ تاریخ سے پوچھئے یہ کام کب اکثریت میں ہوکر کئے گئے ہیں اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی کیا ہے؟ جہاد کے واجب ہونے کا سبب تو موجود ہے جیسے نماز ظہر کے واجب ہونے کا سبب زوال شمس واقع ہوگا تو نماز ظہر واجب ہوگی چاہے نماز پڑھنے والے نماز سے غافل ہوں۔ **الموسوعة الفقهية** کی یہ عبارت مزید باعث تشفی ہوگی:

> "اذا استولى الكفار على بقعة من دار الاسلام صار الجهاد فرض عين على جميع افراد الناحية التى استولى عليها الكفار رجالا و نساء اوصغاراً او كباراً اصحاء و مرضى فاذالم يستطع اهل الناحية دفع العدو عن دار الاسلام صار الجهاد فرض عين على من يليهم من اهل النواحى الاخرى من دار الاسلام وهكذا حتى يكون الجهاد فرض عين على جميع المسلمين ولا يجوز تمكين غير المسلمين من دار الاسلام وياثم جميع المسلمين اذا تركوا غيرهم يستولى على شئى من دار الاسلام"(جلد۲۰)

ترجمہ: جب کفار دارالاسلام کے کسی علاقہ پر قابض ہوجائیں تو اس علاقہ کے تمام افراد پر جہاد فرض عین ہوجائے گا۔ خواہ مرد ہوں یا عورت، بچے ہوں یا بوڑھے، صحت مند ہوں یا بیمار۔ جب اس علاقہ کے لوگ

دشمن کو دارالاسلام سے دفع نہ کر سکیں تو ان سے متصل رہنے والوں پر فرض ہوگا اور اسی طرح ہوگا یہاں تک کہ تمام مسلمانوں پر فرض عین ہوجائے گا۔ اور دارالاسلام پر غیر مسلمین کو قبضہ دے دینا جائز نہیں ہوتا اور دارالاسلام کے کسی جز پر غیر مسلمین کو قابض چھوڑ دیں گے تو تمام مسلمان گنہگار رہوں گے۔

اوپر ہم نے دارالاسلام اور دارالحرب کے تعلق سے قرآن اور فقہاء اسلام کی تعریف اور تصریحات کی روشنی میں جو گفتگو کی ہے اس سے یہ بات صاف طور سے سمجھ میں آ جانی چاہئے کہ یہ اصطلاحات حالات کے تناظر میں نہیں استعمال کی گئی ہیں بلکہ قرآنی حقائق کی تعبیر کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ لہٰذا حالات کے بدلنے کے باوجود قرآنی حقیقتیں اپنی جگہ باقی رہیں گی اور اقوام متحدہ کی تشکیل سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے اور مولانا عتیق صاحب کی بات بالکل لچر ہے۔

ایک آیت پر گفتگو

یحییٰ نعمانی صاحب نے ایک آیت پر جو گفتگو فرمائی ہے اس سے وہ بات نکلتی ہے جس کو ہمارا گمان یہی ہے کہ مولانا بھی پسند نہیں کرتے ہوں گے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. (الانفال:۳۹)

مولانا نعمانی صاحب فتنہ کے معنی مذہبی جبر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

''مفسرین نے فتنہ کے معنی شرک بتایا ہے وہ لازمی معنی ہے۔ جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ مذہبی جبر ختم ہوجانے تک جنگ کا حکم ہے، مذہبی جبر ختم ہوجائے تو خواہ شرک باقی رہے تو بھی جنگ نہیں ہے پھر موصوف نے لکھا ''آج کے زمانے میں الحمدللہ دنیا میں شاید ہی ایسا مذہبی جبر کہیں موجود ہوگا جس کو اس طرح کا اصطلاحی فتنہ کہہ سکیں جیسے فتنہ کا سامنا مسلمانوں کو مکہ میں تھا۔'' (الجہاد، صفحہ ۲۶)

ان دونوں باتوں کو ملایا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ اب جہاد کا دور ختم ہوگیا۔ اس لئے کہ جہاد کا حکم مذہبی جبر کے خاتمہ کے لئے تھا۔ اس زمانہ میں مذہبی جبر نہیں تو جہاد کا کیا سوال۔ اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ جہاد سے متعلق پچاسوں آیات قرآنی بالخصوص ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ'' کا کیا ہوگا؟ کیا ان کو منسوخ مانیں گے؟ اور پچاسوں احادیث جن میں جہاد کا کسی نہ کسی طرح ذکر ہے ان کا کیا ہوگا؟

بالخصوص ''الجهاد ماضٍ الى يوم القيامة'' کا کیا ہوگا؟ ان دونوں سوالوں پر اگر آپ صحیح معنی میں غور کریں گے تو آپ لازماً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس دور میں مذہبی جبر کے ختم ہونے کی وجہ سے حکم جہاد ختم ہونے کی بات نہایت غلط اور گمراہ کن ہے۔

فطری طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہزار ہا سال تک جس مذہبی جبر کی تاریخ قرآن میں ملتی ہے وہ انیسویں اور بیسویں صدی میں کیونکر ختم ہوگی؟

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

یہ شرار بولہبی کی ستیزہ کاری بیسوی صدی میں یکلخت کیسے ختم ہوگئی۔ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ ہرگز نہیں! انسانی فطرت اپنی جگہ قائم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کی تاریخ پر قرآن شاہد عدل ہے اس پر کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کون سی صدی ہے جو مذہبی جبر سے خالی ہے اس کی نشاندہی کی جائے۔

تیرہویں صدی عیسویں میں اسپین میں جو سانحہ پیش آیا کہ مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی حکومت ختم ہوگئی بلکہ ان کے وجود سے اسپین بالکل خالی ہو گیا۔ اس واقعہ کو کس خانہ میں ڈالیں گے اور اس کو کیا نام دیں گے؟ پھر کمیونسٹ روس میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اس کو مذہبی جبر نہیں کہیں گے؟ پھر حالیہ دور میں بوسنیا، چیچنیا، برما وغیرہ میں کس جبر کا مظاہرہ ہوا ہے؟ ہندوستان میں ہماری آنکھوں کے سامنے ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ وارانہ ہزاروں فسادات ہوئے اور بے شمار مسلمانوں کی جانیں تلف ہوئی ہیں کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ فرقہ وارانہ فسادات کے بعد دہشت گردی کے نام پر جو زیادتیاں ہورہی ہیں اور بے قصور نوجوانوں کی زندگیاں برباد کی جارہی ہیں اس کے لئے کوئی نئی اصطلاح بنانی پڑے گی۔ اس سب کے پیچھے اسلام اور مسلمان دشمنی کے علاوہ کونسی ذہنیت کارفرما ہے؟

قرآن نے اول دن کہہ دیا تھا "وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ" یہ ایک غیر مبدل حقیقت ہے جس کی وضاحت لفظوں میں یہ ہے کہ جب تک تم اپنے دین پر قائم رہو گے۔ اعداء اسلام خوش اور راضی نہیں ہو سکتے۔ ہاں جس قدر تم دین سے دور رہو گے کفار ومشرکین اسی قدر تم سے خوش رہیں گے اور تمہارے ساتھ رعایت کریں گے اور نرمی کا برتاؤ کریں گے۔ اس قرآنی نص اور تاریخ کی روشنی میں یہ خیال کہ دور جدید میں مذہبی جبر ختم ہو گیا ہے اس لئے جہاد کی ضرورت باقی نہیں خام خیالی ہے پھر یہ بھی بے بنیاد بات ہے کہ جہاد محض جبر وظلم کو ختم کرنے کے لئے مشروع قرار دیا گیا ہے۔

پھر آیت کی طرف لوٹئے، فتنہ کے جو معنی آپ بتارہے ہیں وہ قطعی نہیں ہے، فتنہ بمعنی شرک ہے، اس کو یہ کہہ کر بے وزن نہیں کیا جا سکتا ہے کہ فتنہ کا لازمہ شرک ہے اس لئے فتنہ کی تفسیر شرک سے کی گئی ہے۔ اس لئے کہ

یہاں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرآن اصل میں شرک کی نفی کرنا چاہتا ہے لیکن شرک کا لازمہ فتنہ ہے اس لئے شرک کے بجائے فتنہ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تا کہ قتال کے لئے مزید ترغیب پیدا کی جاسکے۔

ذہن کو آگے بڑھایئے قتال کا خاتمہ صرف فتنہ کے خاتمہ پر منحصر نہیں کیا گیا ہے بلکہ کہا گیا کہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے ایک بات ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ دین اللہ کے لئے ہوجائے۔ غور کیجئے، کیا شرک کی موجودگی یا شرک کے غلبہ کی صورت میں دین اللہ کے لئے ہوسکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ اور طاغوت دونوں کی اطاعت بیک وقت کی جائے؟

اس طرح آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ فتنہ کی جو بھی تفسیر آپ کریں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بات یہی سامنے آئے گی کہ جنگ اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم ہے جب تک شرک ختم ہوکر دین اللہ کے لئے نہ ہوجائے۔ حجاز میں شرک کی موجودگی اور حجاز کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں غلبہ شرک وجہ قتال ہے۔

مذہبی جبر میں جو کمی معلوم ہورہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مسلمان اس دور کے ایک نئے شرک پر راضی ہوگئے ہیں، یعنی مسلمانوں نے پرائیویٹ زندگی میں اللہ و رسول کی اور اجتماعی زندگی میں اولیاء شیطان کی اطاعت کرنے کا عہد کرکے اپنے آپ کو محفوظ بنالیا ہے، اس نئے شرک کا خوبصورت نام سیکولرزم ہے جہاں کہیں مسلمان اس نئے شرک سیکولرزم کو تسلیم نہیں کرتے وہاں ایسے جبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جس کے سامنے فرعون اور نمرود کا جبر ہیچ ہے۔

نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ

> ''الغرض اسلام میں قتال کو جو 'جہاد فی سبیل اللہ' کا مقام اور درجہ دیا گیا، اور اس پر اس قدر اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا تو وہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ یہ مسلمانوں کے قومی دفاع کا ضروری ذریعہ ہے اور یہ ایک باغیرت و خود دار قوم کے قومی، سیاسی اور اخلاقی وجود کے لئے ضروری ہے۔
>
> بلکہ مسلمانوں کی جنگ کے جہاد بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اصل غرض و غایت قومی دفاع و تحفظ اور جان و مال کی حفاظت کے بجائے اللہ کی رضا و خدا پرستی اور اس کے دین کی حفاظت، انسانوں کی ہدایت و خیر خواہی اور ان کو شر و فساد اور ظلم و گمراہی سے بچانے کی سچی محبت ہو، اسی لئے آں حضرت ﷺ نے صاف طور سے اعلان کردیا کہ قومی جذبے سے لڑنے والے قطعاً مجاہد نہیں ہیں۔'' (صفحہ ۳۲)

بلاشبہ مسلمان امت عام معنی میں دوسری قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہے لیکن قوم ہونے سے بالکل انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، چاہے تھوڑا بدلے ہوئے لفظوں میں ملت و امت کہنا چاہیئے۔ ہر قوم و ملت کی ایک بڑی ضرورت دفاع اور حفاظت جان و مال ہوتی ہے اس ضرورت کو پورا کرنا بھی جہاد ہے بشرطیکہ اللہ کی خوشنودی کے

لئے یہ کام کیا جائے، کام تو ایک ہی کرنا ہے خواہ آدمی کی نیت کچھ ہو۔ ایک ہی کام ایک آدمی کے لئے جہاد ہے اور وہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا اور اگر نیت غلط ہو تو وہی کام دوسرے آدمی کے لئے جہاد نہیں ہے۔ بہر صورت دفاع اور رضائے الٰہی خدا پرستی میں تضاد نہیں۔ دفاع میں جو کام کیا جاتا ہے وہ باعث ثواب بھی ہوسکتا ہے اور باعث عذاب بھی۔ قومی اور ملی دفاع کو حقیر بتانا مناسب نہیں ہے۔

''من لم یھتم بامر المسلمین فلیس منھم'' (رواہ الحاکم فی مستدرکہ)

بسا اوقات ایک شخص اپنی نیت میں کمی کی وجہ سے ثواب سے محروم ہوسکتا ہے مگر اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وان اللّٰہ یؤید ھذاالدین بالرجل الفاجر'' اس بناء پر کسی کے فتور نیت کی وجہ سے قومی دفاع کو جہاد کی فہرست سے خارج قرار دینا صحیح نہیں ہے، دفاع کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرنا اچھا کام نہیں ہے بلکہ تلقین کرنی چاہئے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو جیسے نماز ہے اس کا انکار کرنے یا اس سے روکنے کے بجائے صحیح نیت کے ساتھ لوگ نماز پڑھیں اس پر زور دینا مناسب ہوگا۔

نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ

''جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی پہلی شرط یہی ہے کہ اس کام کے لئے انسانوں کا جو گروہ کھڑا ہو اس کی غالب جماعت کی ایسی تربیت کی جاچکی ہو، اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے کے مطابق اس کے دلوں کا ایسا تزکیہ کیا جاچکا ہو کہ اس کے پیش نظر نہ اپنی اور اپنی قوم کی حکمرانی اور سیادت قائم کرنا ہو اور نہ کسی دوسری قوم کو زیر کرنا'' (الجہاد)

اس عبارت میں واضح نہیں ہے کہ پہلی شرط کس بات کے لئے ہے تربیت، تزکیہ کی صفت پیدا کرنا چاہئے اور ہر مسلمان کو تمام صفات مومنانہ سے کما حقہ متصف ہونا ایک ضروری امر ہے، لیکن قرآن وسنت میں کہیں حکم نہیں دیا گیا کہ جو لوگ مومنانہ کردار کے حامل نہیں ہیں ان کو میدان جہاد سے دور رکھا جائے اور کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ شرکت جہاد کے لئے فلاں فلاں فضائل حسنہ شرط ہیں اور تاریخ وسیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد میں ایسے لوگ بھی شریک ہوا کرتے تھے جن پر ایمان لانے کے بعد چند ماہ بھی تربیت اور تزکیہ کا عمل نہیں کیا گیا حتیٰ کہ منافقین کو بھی شرکت جہاد سے روکا نہیں گیا۔ ایک دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل ایسی ہے کہ فرض صوم کی بات آئے تو کہا جائے کہ پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی نماز کا پابند ہو۔ زکوۃ کا مسئلہ سامنے آئے تو کوئی کہے کہ زکوۃ کی کیا بات کرتے ہو پہلے صوم وصلوۃ کا پابند بنایئے۔

فقہی اور قانونی لحاظ سے دیکھئے، دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد روزہ اور زکوۃ کے وجوب کے لئے یہ

شرط نہیں ہے کہ آدمی باکردار ہو اور نمازی ہو، وجوبِ صلوٰۃ کے لئے طہارت کو شرط بنایا لیکن طہارت شرط ہے ادائے صلوٰۃ کے لئے۔ طہارت نہیں ہے تو صلوۃ کا وجوب ختم نہیں ہوگا۔ اسی طرح وجوب جہاد کے لئے ایمان کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے دارالاسلام کے کسی حصہ پر غیر قابض ہو جائیں تو ہر مسلمان پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے چاہئے عالم ہو کہ جاہل۔ نمازی ہو کہ غیر نمازی۔

مولانا نعمانی نے ''اقدامی جہاد'' کرنے کی ذیلی سرخی لگا کہ صفحہ ۳۷ تا ۴۶۔ دس صفحہ، جو کچھ لکھا ہے وہ اقرار وانکار کے درمیان کی بات ہے، نہ صاف اقرار کر سکتے ہیں اور نہ صاف انکار کرتے ہیں، لیکن مجموعی طور سے اقدامی جہاد کے انکار کا موڈ ظاہر ہے مثلاً حجت تمام کرنے کی محنت کا مسئلہ ہے کہ جس کا یقین تقریباً ناممکن ہے، مثلاً بیس سال حجت تمام کرنے کی محنت کچھ لوگوں پر کی گئی جب تک ایک نئی نسل تیار ہوتی ہے جن پر حجت تمام کرنے کی ضرورت پیش آجائے گی۔

سب سے بڑی بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ یہ حجت تمام کرنے کی شرط کہاں سے اخذ کی ہے؟! اس سے انکار نہیں ہے، افہام وتفہیم کی جان توڑ کوشش پوری دلسوزی کے ساتھ کرنی چاہئے لیکن اس کو شرط بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ سیرت اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے علاوہ کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے جہاں تیرہ سال تک محنت کر کے حجت تمام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکم جہاد کے بعد اتمام حجت کے لئے کہیں برسوں انتظار نہیں کیا گیا، عرب کے سواء دوسرے ملکوں میں ایسا نہیں ہوا کہ مہینوں اور برسوں دعوت وتبلیغ کی محنت کی گئی ہو پھر جہاد کیا گیا ہو بلکہ ایک ساتھ دعوت اسلام، دعوتِ جزیہ اور دعوت میدان دی گئی۔

نعمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

> ''اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کسی غیر مسلم حکومت کے خلاف اقدامی جہاد کا جواز اسی صورت میں ممکن ہے جب ایک ایسی امت موجود ہو جو صحیح اسلام کی عملی نمائندگی میں اس درجہ کو پہنچ چکی ہو جو ''منصب شہادت'' کا کم سے کم معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (صفحہ ۴۶)

سوال یہ ہے کہ ''اقدامی جہاد'' کے جواز کو منصب شہادت کے درجہ پر پہنچنے کو موقوف قرار دینا آپ نے کہاں سے نکالا ہے؟! منصب شہادت پر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو مکہ ہی میں بیٹھا دیا گیا تو شہادت حق کے فریضہ کی ادائیگی پہلی وحی کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی اگر مسلمان اس وقت منصب شہادت تک نہیں پہنچے ہیں تو حکم جہاد ہی کیوں، حرمت شراب، حرمت ربا اور ادائیگی صوم، جمعہ اور حج کو موقوف کر دینا چاہئے۔ اور آپ کے بموجب یہ سب احکام منصب شہادت پر مسلمان فائز ہوئے تو نازل ہوئے۔ کسی حکم کے لاگو یعنی واجب ہونے کا

سبب پیدا ہو گیا تو وہ حکم واجب ہو گیا۔ چاہے جن پر واجب ہوا ہے ان کے اندر اس کی ادائیگی کے شرائط موجود ہوں یا نہ ہوں، مثلاً زوال شمس ہو گیا تو جمعہ واجب ہو گیا چاہے لوگوں کے اندر طہارت نہ پائی جاتی ہو، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ زوال شمس یعنی جمعہ کے وجوب کے بعد کسی نے عدم طہارت کی بناء پر جمعہ نہ ادا کیا تو وہ ترک واجب کا مجرم ہو گا۔ زیر بحث مسئلہ میں اصل دیکھنا یہ ہے کہ وجوب جہاد کا سبب کیا ہے؟ اگر سبب وجوب ہے تو اس کے وجوب کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

صفحہ ۵۹، ۶۰ پر صلح کی جو حیثیت دینی بتائی گئی ہے اس پر ہم زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے، کیونکہ مولانا موصوف نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ فقہاء کے نزدیک صلح عارضی چیز ہے، چنانچہ ان فقہاء کے نزدیک قتال واجب اور صلح جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قتال ہر حالت میں کرنا ہے لیکن صلح حسب موقع و مصلحت کی جا سکتی ہے، مولانا موصوف نے نہ معلوم کہاں سے کہا کہ ''ورنہ اسلام کے قانون بین الاقوامی میں اصل صلح ہی ہے۔'' حالانکہ بعض بزرگوں کے نزدیک صلح کا حکم منسوخ ہے۔ یعنی صلح کا دین میں کوئی مقام ہی نہیں ہے۔

مولانا نعمانی صاحب کی اس عبارت پر غور کیجئے:

''یہاں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ''وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ'' جو جنگ کا مقصد بتلایا گیا ہے، یعنی یہ کہ جنگ کرو۔ ''تاکہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے''، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے جنگ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کی سب سے اہم اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لے کر صلح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلامی جہاد کے تصور کی بنیاد یہ خیال ہے کہ سوائے مسلمانوں کے کسی اور قوم کو اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ حکم اصلاً صرف جزیرۃ العرب کے لئے ہے کہ اس میں اسلام کے علاوہ کسی اور کی حکومت کو باقی رکھنا مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں چھوڑا گیا تھا۔ قرآن نے یہ بات بالکل صاف کی تھی کہ مکہ کی حیثیت ایک ''ابراہیمی و اسماعیلی وقف'' کی ہے اور بنی اسماعیل کا یہ پورا ہی علاقہ ابراہیمی دعوت کے مرکز بننے کے لئے خاص کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا اس جزیرہ کے اندر سلسلۂ قتال کا آخری مقصد اور اس کی غرض و غایت یہ بتائی گئی کہ جزیرۃ العرب تمام تر اللہ کے دین کے تحت آ جائے۔

اسی آیت کی گویا وضاحت تھی رسول اللہ کی یہ خاص وصیت کہ ''مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے'' (صحیح بخاری ۳۰۵۳ و صحیح مسلم ۱۷۶۷)۔ اور یہی آیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی بھی بنیاد تھی کہ ''لا یبقین دینان فی جزیرۃ العرب'' جزیرۃ العرب میں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی گنجائش نہ رہے۔ (موطا: ۱۳۸۸)

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے قرآن کا حکم ہے کہ اگر کوئی قوم شریفانہ صلح کے لئے آمادگی کا اظہار کرے تو اس کو ضرور قبول کیا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم ریاست مسلمانوں کے ساتھ صلح پر آمادہ ہوسکے اور اپنے علاقہ میں پر امن طور پر اسلام پر عمل کرنے اور اپنی سرزمین پر اللہ کے بندوں کو اللہ کی عبادت اور بندگی کرنے دیتی ہے اور اللہ کے بندوں کو اس کے دین وشریعت کی طرف دعوت دینے اور اس کی راہ پر چلانے کی اس جدوجہد میں (جس جدوجہد کے لئے ہی امت اسلامیہ کو اصلاً وجود بخشا گیا تھا) طاقت کے زور سے حائل نہیں ہوتی، یعنی ظلم اور ''فتنہ'' کی صورت نہیں پائی جاتی، تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے دعوت ونصیحت کے راستے کے امکانات کو استعمال کرنے سے پہلے قتال وجنگ کرنا جائز نہیں ہوگا بلکہ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس راستے پر خوب محنت کرلیں یہاں تک کہ اللہ کی حجت تمام ہوجائے، اور اللہ اپنی سنت کے مطابق کوئی فیصلہ فرمادے جو حجت تمام ہونے کی صورت میں وہ یقیناً فرمایا کرتا ہے۔'' (صفحہ ۶۲ تا ۶۳)

یہ پوری عبارت یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے کہ یہ خیال کہ سوائے مسلمانوں کے کسی اور قوم کو اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے غلط ہے، لیکن اس کو ثابت نہ کرسکے کیونکہ پہلے تو حجاز کی حد تک اس کو صحیح تسلیم کیا اس کے بعد آخر میں یہ کہا کہ دعوت ونصیحت سے پہلے قتال وجنگ کرنا جائز نہیں ہے، یعنی نصیحت اور دعوت کے بعد جائز ہے اس طرح جو چیز مولانا ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کے برخلاف یہ ثابت ہورہا ہے کہ یہ خیال صحیح ہے کہ مسلمانوں کے سوائے کسی اور قوم کو اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔

''جہاد کی کچھ اہم شرطیں'' اس ذیلی عنوان کے تحت مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ محل نظر ہے اس سلسلہ میں واضح رہنا چاہئے کہ امیر کی اطاعت تو ضروری ہے لیکن وجوب جہاد کے لئے امیر کا ہونا شرط نہیں ہے البتہ وجوب جہاد کی ادائیگی کے لئے امیر کا ہونا شرط ہے اور یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا امیر بنائیں گے اگر امیر نہ بنائیں گے اور واجب ادا نہ ہوگا تو وہ گناہگار رہوں گے۔ مثلاً حاکم شہر اور جمعہ کی امامت کرنے والا کوئی نہ ہو تو ایسا نہیں ہے کہ جمعہ کا وجوب ساقط ہوجائے گا اور جمعہ نہ ادا کرنے پر مسلمانوں سے باز پرس نہ ہوگی۔

دوسری بات یہ بھی واضح رہنی چاہئے کہ ملک کے ہر حکمران کو امیر کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا ہے کہ اس کی اطاعت لازم قرار دی جائے، حکمران کلمہ گو نہ ہو تو اس کی اطاعت کو شرعاً واجب نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کی اطاعت کہاں تک جائز ہوگی اس پر غور کرنا پڑے گا۔ اسی طرح مسلمان حکمران جو پابند شرع ہونے کے بجائے فسق وفجور میں سراسر ڈوبا ہوا ہے اور دین وشریعت سے ہٹ کر کفر وشرک پر مبنی دستور اور قانون کی اساس پر حکمرانی چلا رہا ہے اس کی اجازت کے بغیر جہاد کی بات کرنا غلط ہے ایسا اگر آپ کہتے ہیں تو اس کی کیا شرعی بنیاد ہے؟

کیا چین کے غیر مسلم حکمران یا حسنی مبارک جیسے مسلم حکمرانوں کی اجازت اور منظوری کسی شرعی واجب کے ادا کرنے کے لئے ضروری ہوگی؟ جبکہ ایسی حکومت میں برضا ورغبت زندگی گزارنا ہی محتاج دلیل اور منافیٔ ایمان ہے "فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ" کی روشنی میں غور فرمایئے اور ایک تیسری بات بھی ذہن میں رکھئے کہ جتنی بھی شرطیں ہیں ان میں سے اکثر اقدامی جہاد کے سلسلہ میں ہیں دفاعی جہاد کے لئے کوئی شرط نہیں ہے، نہ امیر سے اجازت کی ضرورت ہے، نہ بیٹے کو باپ سے، نہ بیوی کو شوہر سے اور نہ خاص پہلے سے تیاری کی ضرورت ہے، اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت میں جو کوشش آدمی کرتا ہے وہ دفاعی جہاد کے زمرہ میں آتا ہے تو اگر اپنی ناموس بچانے کے لئے کوئی مسلمان مار اور مر سکتا ہے تو ناموسِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صیانت میں کیوں نہیں مار اور مر سکتا ہے اس کے لئے کس کے حکم اور کس کی اجازت کی ضرورت ہوسکتی ہے؟!

''عہد اور معاہدہ'' یقیناً عہد اور معاہدہ کی پاسداری اسلام میں بہت ضروری ہے اور ایک مسلمان کو ایفاء عہد اور رعایت معاہدہ کرنا ضروری ہے، لیکن اس دور میں ملکوں کے دستور اور قانون کو کس قرآن، کس حدیث اور کس عقل سے معاہدہ آپ قرار دے سکتے ہیں؟

ان کا لحاظ بس اس اعتبار سے ایک اہم چیز ہے کہ کسی حد تک امن واَمان باقی رہے، مثلاً سڑک پر بائیں سے چلنے کا قانون ہے بائیں سے چلنا چاہئے تاکہ ایکسیڈنٹ سے بچا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کو دین وایمان بنا کر کسی بھی حالت میں اس پر عمل کو ضروری قرار دیا جائے حتی کہ اسلام کے اہم سے اہم تقاضہ کو اس کے لئے نظر انداز کردینے کو دین اور دین کا تقاضہ بتایا جائے اور اس قانون پر عمل کرنے کو اتنا ضروری قرار دیا جائے کہ اس کے لئے ماں بیٹی کی عزت قربان کردی جائے۔ کسی ملک کا دستور ہو اس کو کوئی مسلمان قرآن اور فرمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درجہ کس دلیل کی بنیاد پر دے سکتا ہے؟ ایک مسلمان کے نزدیک ملکی دستور اور قانون کا نمبر قرآن وسنت کے بعد آتا ہے۔

غور فرمایئے، معاہدہ دو ہم پلہ فریق میں ہوتا ہے، دونوں فریق کے نمائندے باہم بات چیت کرکے کچھ نکات پر اتفاق کرتے ہیں اور اس کے بعد متفق علیہ نکات پر دستخط کرتے ہیں۔

اس وقت دنیا میں دو ہی قسم کی حکومتیں ہیں ایک شاہی اور دوسری جمہوری۔ بتایئے کس شاہی حکومت نے اپنی رعایا کو اپنا ہم پلہ سمجھ کر ان سے بات چیت کی ہے اور پھر دونوں فریق نے باہم اتفاق کرکے ملک کا دستور بنایا ہے؟ اور کس جمہوریت نے اپنی اقلیت کو اپنا ہم پلہ اور برابر سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا ہے؟ اور اقلیت میں

کچھ لوگوں کو مشورہ میں شریک کیا بحیثیت نمائندہ؟

اگر لیا ہے تو ایسے نمائندوں کو لیا ہے جو اقلیتوں کے حقیقی نمائندہ نہیں ہوتے ...... بلکہ غالب پارٹی کے دراصل نمائندہ ہوتے ہیں، ایسی صورت میں ملکوں کے دساتیر کو سب کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن حکومت اور پبلک کے درمیان معاہدہ نہیں کہہ سکتے ہیں اور پھر ایسا معاہدہ جس کے ایفا کے لئے دین وایمان کو قربان کردینے کو کہا جائے نہایت غلط ہے۔

غرض ملکی دستور اور قانون کی رعایت اور لحاظ کی ایک اہمیت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کی ایک حد ہے مگر اللہ اور رسول سے جو معاہدہ ہوتا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے اس کی پابندی میں جان ومال سب کچھ قربان کیا جاسکتا ہے۔

(۲۰۱۳ء)



جہاد کی کچھ اہم شرطوں کی حقیقت



ماہنامہ افکار ملی کی اشاعت جنوری ۲۰۱۶ء میں یحییٰ نعمانی صاحب کا مضمون ''جہاد کی کچھ اہم شرطیں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ موصوف کی ایک کتاب ''جہاد'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، غالباً یہ مضمون اسی کتاب کا ایک حصہ ہے وہ ہم نے دیکھی ہے۔ کتاب لکھنے کی غرض بتائی گئی ہے جہاد کی صحیح تصویر پیش کرنا، لیکن باتیں ایسی کی گئی ہیں کہ جہاد کا تصور ہی ختم ہوجائے کہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری''۔ جہاد کے تصور کو ختم کرنے کی بات قادیانیوں اور بہائیوں نے انگریز بہادر کی خوشنودی کے لئے کی تھی۔ اب نہیں معلوم کس کی خوشنودی کے لئے یحییٰ نعمانی صاحب اور ان کی کتاب پر مقدمہ اور پیش لفظ لکھنے والوں نے کی ہے؟

کتاب میں جہاد وقتال کی علت قتال کو بتایا گیا ہے یعنی جہاد صرف ان سے کیا جائے گا جو مسلمانوں سے جنگ کریں اور بقیہ لوگوں سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی۔ یہ بات ایسی ہے جس سے جہاد کا آدھا تصور ختم ہوجاتا ہے۔ حالانکہ قرآنی آیات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاد وقتال کی علت کفر اور غلبۂ کفر ہے۔ حجاز میں کفر ہے یعنی حجاز میں کفر برداشت نہیں کیا جائے گا بقیہ ساری جگہوں میں کفر کے وجود کو برداشت کیا جائے گا غلبۂ کفر کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس اصول کو سامنے رکھیے اور مندرجہ ذیل آیات اور حدیث پڑھیے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوجائے۔

اس آیت پر غور کیجئے۔ جنگ کرتے رہنے کا حکم ہے اس وقت تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین پورا اللہ کے لئے ہوجائے۔ پہلی بات ''فتنہ ختم ہوجائے'' کا مطلب یہ ہے کہ شرک ختم ہوجائے۔ فتنہ سے مراد شرک ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس دور میں فتنہ کے معنی مذہبی جبر بتاتے ہیں اور انہی میں ہمارے یحییٰ نعمانی صاحب بھی ہیں۔ اور

ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ ’’اس دور میں مذہبی جبر موجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے جنگ کا کیا سوال؟‘‘

یہ بات حقیقتاً صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں بھی جہاں بھی مذہب پر حقیقی اور وسیع معنی میں عمل کیا جاتا ہے۔ وہاں جبر دیکھنے میں آتا ہے۔ بالفرض ان لوگوں کی بات صحیح بھی ہو تو بھی ان کا مقصد اور مدعا ثابت نہیں ہوتا اس لئے کہ آیت میں دو جزء ہیں۔ ایک تو یہ کہ جنگ کا مقصد فتنہ کو ختم کرنا بتایا گیا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ بتایا گیا کہ دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوجائے۔ سوچئے دین کے اللہ کے لئے ہوجانے کا مطلب کیا ہے؟ سوااِس کے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کی اطاعت کی جائے اور اللہ کا بھیجا ہوا دین اور شریعت نافذ ہوجائے اور کسی شعبۂ حیات میں غیر اللہ کی اطاعت نہ کی جائے یعنی دین وشریعت اپنے کلیات اور جزئیات کے ساتھ نافذ ہوں۔ جب تک ایسا نہ ہو اس وقت تک جنگ کرتے رہنے کا حکم ہے۔ اب پلٹ کر کے پھر دیکھئے اس سے جنگ کرنے کی علت اور وجہ کیا معلوم ہوتی ہے اس بات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ جنگ صرف ان سے کی جائے گی جو ہم سے جنگ کریں۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کی علت غیر اللہ کی اطاعت کا ہونا ہے۔

دوسرے لفظوں میں نظام کفر تسلیم کرنا اور اس کو اپنی زندگی میں جاری وساری کرنا یہ جنگ کی علامت ہے۔ ایسی شکل میں عقیدۂ کفر اور شرک کی موجودگی کو جنگ کی علت بتانے کے سوا کسی دوسری چیز کو جنگ کی علت کیسے بتایا جاسکتا ہے؟ جنگ ہر شخص اس سے کرتا ہے جو اس سے جنگ کرے۔ جنگ کے جواب میں جنگ تو ایک عام بات ہے۔ اس میں اسلامی جنگ وقتال کی کیا خصوصیت رہ جاتی ہے؟ اسلامی جنگ اور قتال کی خصوصیت تو یہ ہے کہ عقیدۂ کفر اور اس پر عمل کو ختم کرنے کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، ایسی حالت میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو لوگ عقیدۂ کفر رکھتے ہیں اور کفر پر مبنی پورا اپنا نظام زندگی چلاتے ہیں، اللہ کی اطاعت کے بجائے غیر اللہ کی عبادت اور اطاعت کرتے ہیں ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور ان سے جنگ نہ کی جائے؟ کیا اس آیت کی رو سے ان کی گنجائش نکلتی ہے؟ سنجیدگی سے غور کیجئے۔ جبکہ اس آیت میں اور اس کے علاوہ دوسری آیات میں بھی ایسے لوگوں کو ان کی کافرانہ حالت پر چھوڑنے کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

(۲)۔ اس کے بعد سورۃ التوبہ کی ایک دوسری آیت پر غور کیجئے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ○ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت پر غور کیجئے اور دیکھئے جن لوگوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے ان کے بارے میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جو حرام قرار دیا ہے وہ حرام نہیں مانتے۔ تیسری بات یہ کہ دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ کیا اس سے یہ سمجھا نہیں جاسکتا کہ ان سے جنگ کی علت یہی تین چیزیں ہیں۔ پھر آیت کے آخری ٹکڑے سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کو اپنی حالت پر چھوڑا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ چھوٹے بن کر رہیں اور جزیہ ادا کریں۔

معلوم ہوا کہ اہل شرک اور کفر کو، ان کی کفریات اور شرکیات کو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے غلبہ کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جائے گا اور ان کے غلبہ کے باقی رہنے تک ان سے جنگ کی جائے گی یہاں تک کہ چھوٹے بن کر اور ماتحت ہو کر زندگی گزاریں۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے یہ کہنا اور سمجھنا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ جو لوگ اپنی جگہ پر امن وسکون کے ساتھ رہتے ہیں اور چاہے وہ اسلام کے عقیدہ کو نہ مانیں اور دین حق کو نہ اپنائیں، ان کے اقتدار کو گوارہ کیا جائے گا اور ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے گی اور اسلام کو ان کے غلبہ واقتدار سے کوئی بحث نہیں ہوگی۔ آیت کی جو منشا ہم نے بتایا ہے اس کی تائید اس طور سے بھی ہوتی ہے کہ رسول برحق کو دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا ہے تا کہ سارے ادیان پر اللہ ان کو غالب کردے یعنی دین اور شریعت کے آنے کا جہاں یہ مقصد ہے کہ اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کیا جائے وہیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ تمام ادیان باطلہ مغلوب کردیئے جائیں۔

③- امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الا الہ الا اللّٰہ۔

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں۔

اوپر کی آیات اور حدیث کی تائید فقہ کا یہ جملہ کرتا ہے:

④- قتال الکفار واجب وان لم یبدؤ نا۔

ترجمہ: کفار سے جنگ واحب ہے اگرچہ وہ ہم سے ابتداء نہ کریں (چاہے وہ ہم سے نہ لڑیں)۔

یہ حدیث ایک اشکال کو ختم کرتی ہے۔ وہ اشکال یہ ہے کہ قرآنی آیات پر بحث کرتے ہوئے ہم نے بتایا کہ کفر کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور کفر اور شرک کو ختم کرنے کے لئے قتال مشروع ہے اور پھر دوسری آیت

پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے بتایا کہ اہل کفر اور شرک ماتحت بن کر کے رہیں۔ تو ان دونوں باتوں میں بظاہر ٹکراؤ اور تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اس اشکال کو یہ حدیث ختم کرتی ہے۔ اس طور سے کہ حدیث جزیرۃ العرب سے متعلق ہے اور سورۃ التوبہ کی آیت اہل کتاب اور دنیا کے بقیہ اہل شرک سے متعلق ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اہل کتاب کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کا صاف حکم دیا گیا ہے، چنانچہ اس پر آج تک عمل ہو رہا ہے اور ان کو آج بھی جزیرۃ العرب کی شہریت نہیں دی جاتی۔

جہاد و قتال کی علت جنگ کو بتانے کے علاوہ یحییٰ نعمانی صاحب نے جہاد کے لئے شرط امام کی بتائی ہے کیونکہ اس دور میں مسلمانوں کا کوئی امیر نہیں ہے اس لئے جہاد کا کیا سوال؟ دوسرے اسلام میں معاہدہ کی بڑی اہمیت ہے بالخصوص حکومتوں سے جو معاہدہ ہوتا ہے ان کو پورا کرنا اسلام میں اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ نظریہ جوڑ دیا گیا کہ ہر حکومت کا شہری معاہد ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ کچھ بھی کیا جائے وہ شہری حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اسی مضمون میں یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لیکن اب جدید دنیا میں یہ شہریت ایک بڑا وسیع معاہدہ بن گیا ہے۔ ریاست کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں اور فرد کے تعہدات بھی۔ اس بناء پر یہ بالکل طے ہے کہ جو مسلمان کسی غیر مسلم ملک کا شہری ہو اس کو اپنے اس ملک سے مسلمانوں کے ساتھ کیسے ہی دشمنانہ رویہ کی شکایت ہو وہ جب تک اس ملک کی شہریت کو لئے رہتا ہے اس وقت تک اس کے لئے اس ملک کے خلاف یا اس کے کسی عام شہری کے خلاف کسی قسم کی جنگ وقتال کی کارروائی کرنا جائز نہیں''۔

اس موقع پر ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈیڑھ دوسو سال علماء ہند نے انگریزوں کے خلاف جو جنگ لڑی اس کے لئے ان کے پاس اس جنگ کے جواز کے لئے کیا دلائل تھے؟ اور یہ جنگ ایسی تھی جس میں زبان وقلم اور ہاتھ پیر سب استعمال کئے گئے حتیٰ کہ انگریزوں کے اندر اور باہر جو بھی دشمن تھے ان سے ساز باز بھی کی گئی۔ علماء کا اتنا لمبا یہ کردار یحییٰ نعمانی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے پھر بھی علماء کے اس طویل کردار کی اہمیت اور وزن سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام کالانعام نے نہیں بلکہ حقیقی ہزاروں علماء نے جنگ آزادی میں اپنی جانیں نچھاور کی ہیں۔

اب ہم جہاد کے لئے امام کی شرط کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔

یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

''سلف کا فقہی ذخیرہ آپ پڑھ جائیے آپ کو اس کا کوئی تصور نہیں ملے گا کہ کسی جگہ کے لوگ اپنے حکمرانوں کی اجازت کے خلاف اپنے طور پر جہاد چھیڑیں۔ فقہ کی مشہور کتاب ''المغنی'' میں ایک مختصر سے جملہ میں اس بات کو سمیٹ دیا گیا ہے ''وامر الجهاد موكول إلى الامام'' (المغنی: ۸/۳۴۵) یعنی جہاد کا معاملہ حکمراں کی رائے پر منحصر ہے۔''

لیکن یحییٰ نعمانی صاحب نہیں معلوم کس خیال میں تھے کہ لکھ دیا علماء کہتے ہیں: ''فان عدم الامام لم يوخر الجهاد لان مصلحته تفوت بتاخيره'' (المغنی ۸/۳۵۳) اگر کسی جگہ حکومت ہی نہ ہو تو مسلمان جہاد کو موخر نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ دیر کرنے سے جہاد کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔''

یحییٰ نعمانی صاحب نے ایک ہی کتاب سے فقہ کی دو عبارتیں نقل کی ہیں جس میں سے ایک سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاد امیر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری عبارت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام کی عدم موجودگی میں بھی جہاد ہوسکتا ہے، جہاد رکے گا نہیں۔ ان دونوں عبارتوں میں کیسے تطبیق دی جائے گی فی الحال ہم اس بات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ یہ کام ہم یحییٰ نعمانی صاحب کے حوالے کرتے ہیں۔ البتہ امام کی عدم موجودگی میں بھی جہاد ہوسکتا ہے۔ دوسری عبارت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

امام کی شرط

امام یعنی اسلامی حکومت کا اعلیٰ ذمہ دار، یقیناً امام کا ہونا جہاد کے لئے شرط ہے جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی حکومت نہیں اور نہ مسلمانوں کا کوئی امام اور امیر ہے۔ جہاد کیسے کیا جا رہا ہے؟ لیکن نعمانی صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ یہ شرط کیسی ہے امام کا ہونا جہاد کے وجوب اور فرضیت کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کے لئے ہے جیسے وضو اداء صلوٰۃ کے لئے شرط ہے فرضیت صلوٰۃ کے لئے شرط نہیں ہے اس کا مطلب ہے کہ کسی کو وضو نہیں ہے تو اس سے نماز ساقط نہیں ہوگی اور وضو کے نہ ہونے کا بہانہ کر کے اداء صلوۃ سے بچ نہیں جائے گا اسی طرح امام کا نہ ہونا ترک جہاد کے لئے وجہ جواز نہ بنے گا وضو یعنی شرط کا مہیا کرنا اس کے لئے بندوبست کرنا ان لوگوں کا کام ہے جن پر نماز فرض ہوئی ہے۔

اسی طرح جہاد اپنی جگہ فرض اور واجب ہے اس کے لئے امام کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے البتہ جن لوگوں پر جہاد فرض ہے ان کی یہ دہری ذمہ داری ہے کہ وہ امام بنائیں اور جہاد کریں۔ جیسے نمازی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ وضو کے لئے ضروری انتظام کرے پھر وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ واضح ہوا کہ امام کے نہ ہونے کی بنا پر جہاد کی نفی نہیں کی جاسکتی ہے چنانچہ اس دور میں جو لوگ جہاد کر رہے ہیں وہ اپنا امیر بنائے ہوئے ہیں اور شرط پوری کر رہے ہیں اس لئے ان کو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بغیر جہاد کیسے کر رہے ہیں جیسے کوئی وضو

کے بجائے تیمم کرکے نماز پڑھ رہا ہے تو اس کو نہیں کہا جاسکتا کہ بغیر وضو کے یہ نماز کیسے پڑھ رہا ہے؟

جہاد ہی نہیں بعض دوسرے امور میں بھی امام کا ہونا شرط ہے۔ مثلاً اداء نماز جمعہ اور شرعی عدالتوں کا قیام، نکاح وطلاق وغیرہ کے نزاعات کو چکانے کے لئے شرعی طور پر قاضی کا فیصلہ ضروری ہے اور قاضی کا تقرر امیر اور امام کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اب جبکہ اس دور میں امام اور امیر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ کیسے حل ہو؟ تو اس مقصد کے حل کیلئے آپ کو معلوم ہوگا کہ بہار، اڑیسہ، کرناٹک اور آندھرا میں امارت کا قیام عمل میں آیا۔ اور ان سب جگہوں پر ایک ایک امیر ہیں جو قاضیوں کا تقرر کرتے ہیں اور وہ قاضی فیصلہ کرتے ہیں پھر ان کے فیصلوں کو شرعی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان معاملات میں کہا جائے کہ اسلامی حکومت نہیں یہ کہاں کے امام وامیر؟ اور کہاں کے قاضی؟ اور کہاں کا شرعی فیصلہ؟ تو بات کہاں جاکر رکے گی۔ غور فرمایئے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قضاء کیلئے امام بنایا جاسکتا ہے تو جہاد کی ادائیگی کے لئے امام کیوں نہیں بنایا جاسکتا ہے؟ جس طرح شرعی معاملات میں اسلامی طور پر قضاء ضروری اور فرض ہے اسی طرح جہاد بھی ایک محکم فریضہ ہے اس کو کرنا فرض ہے، شرعی معاملات میں قضاء شرعی اور جہاد دونوں فرض ہیں۔ فرضیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یحییٰ نعمانی صاحب کو چاہیے تھا کہ امام کے نہ ہونے کی بنا پر جہاد کی نفی کے بجائے یہ بتاتے کہ آج کے حالات میں فلاں فلاں وجوہ سے جہاد فرض نہیں ہوتا! لیکن یہ کام مشکل تھا اس لئے کہ قرآن، حدیث اور فقہ میں جو تفصیلات جہاد کے تعلق سے پھیلی ہوئی ہیں ان کی موجودگی میں جہاد کی نفی کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔

معاہدہ کا مسئلہ

یحییٰ نعمانی صاحب نے بلاوجہ معاہدہ کی اہمیت پر کتاب وسنت سے کئی دلائل پیش کئے ہیں۔ معاہدہ کی اہمیت سے کس کو انکار ہے لیکن سوال یہ ہے کہ معاہدہ کب اور کہاں ہوا ہے؟ کسی ایک ملک کو متعین کرکے معاہدہ کی تعیین فرمائیں۔ پھر یہ کہ معاہدہ میں شرعی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نہیں؟ مثلاً یہ بات طے ہے کہ کوئی ایسا معاہدہ جو دین کے بنیادی اصولوں کو پامال کرتا ہو اس معاہدے میں کوئی مسلمان شریک نہیں ہوسکتا اور وہ معاہدہ منعقد ہی نہیں ہوگا۔ ایسا معاہدہ جس میں کافر کی اطاعت کرنا لازمی ہو وہ مسلمان کر ہی نہیں سکتا۔

اب آپ فرمایئے کہ آپ کے ذہن میں کون کون سے ایسے ملک ہیں جس میں یہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس میں کسی شکل میں کافر اور منافق کی اطاعت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس کو آپ معاہدہ کہتے ہیں وہ آج ساری دنیا کی حکومت اور عوام کے درمیان جو دستور اور قانون کے نام سے معاہدہ ہے ان سب میں الا ماشاء اللہ کافر کی اطاعت سے بچا نہیں جاسکتا۔ اس لئے جہاں جہاں بھی ایسا دستور اور قانون ہے وہاں نام نہاد معاہدے میں

کوئی مسلمان شریک نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی شریک ہوتا ہے تو اس کی مسلمانیت پر سوال اٹھے گا اس لئے کہ صریح طور پر کتاب وسنت میں کافر اور منافق کی اطاعت سے روکا گیا ہے اور اس کو کھلا شرک بتایا گیا ہے۔

"وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا"۔ اسی طرح مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے سوا کسی چیز کی اتباع نہ کرے اور ما انزل اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے۔ اس کو خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کہا گیا ہے۔ اب یحییٰ نعمانی صاحب بتائیں کہ دنیا کا کون سا دستور اور قانون ہے جس میں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے ماسوا ساری چیزوں کی اتباع سے بچنے کی گنجائش رکھی گئی ہے! دور نہ جائیے اپنے ملک کو سامنے رکھئے اور سوچئے۔ اسی طرح کون سا دستور اور قانون ہے اور کس ملک کا ہے جس میں معاہدہ کی مدت متعین کی گئی ہو مثلاً اپنے ملک کے معاہدہ کو سامنے رکھئے کہ یہ معاہدہ کتنے مہینے کتنے سال اور کتنی صدی کیلئے ہوا ہے جب کہ نبی ﷺ نے کوئی معاہدہ دس سال سے زیادہ کے لئے نہیں فرمایا اور اسلامی تاریخ میں کتنے معاہدے بلاتعیین مدت ہوئے ہیں تلاش کیجئے۔

دنیا کے جتنے معاہدوں کو آپ گنا سکتے ہیں گنائیے اور بتائیے کہ فلاں فلاں معاہدہ بلاتعیین مدت ہوئے ہیں۔ معاہدے فرد اور فرد کے درمیان ہوتے ہیں یا فرد اور حکومت کے درمیان ہوتے ہیں یا حکومت اور حکومت کے درمیان ہوتے ہیں؟؟ آپ جس کو معاہدہ کہتے ہیں ساری دنیا کے افراد اور قوموں کے درمیان کب معاہدے ہوئے؟ کن کے درمیان ہوئے؟ اس طرح سوچا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہوجائے گی کہ معاہدہ والی بات یحییٰ نعمانی صاحب کی بے بنیاد ایک مفروضہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس دور میں حکومتیں دنیا بھر کی دھاندلیوں، سازشوں اور بداخلاقیوں، بے اصولیوں اور مکاریوں، زور زبردستی کی بنیاد پر بنتی ہیں اور چلتی ہیں۔ ایک عام انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ ان کے شکنجوں میں کسا رہے اور چوں نہ کرے۔

پھر دیکھئے اس دور کے جس دستور اور قانون کو آپ معاہدہ مانتے ہیں اس میں معاہدہ ٹوٹنے کا بھی کوئی ذکر کوئی دفعہ ہے؟ حکومتوں کا قانون اور دستور حکومتوں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ کہیں اس کا ذکر نہیں ہوتا کہ ایسا ایسا ہوجائے تو معاہدہ ختم ہوجائے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ حکومتیں دستور اور قانون کے نام پر جو چاہتی ہیں کرتی ہیں اور ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ شہریوں کی عزت وناموس پامال کئے جاتے ہیں۔ ان کے شہری حقوق غصب کئے جاتے ہیں۔ ان کے مذہبی حقوق پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔ ان کے عقائد اور نظریات کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ ان کے قومی، مذہبی مقامات کی اینٹ سے اینٹ بجائی جاتی ہے اور آپ ہیں کہ ان کے دستور اور قانون کو مقدس معاہدہ مانتے ہیں! جناب کی بات زیادہ سے زیادہ ایک ظن ہے اور ایک ظنی بات درجنوں حتمی اور قطعی نصوص کے ذریعہ ثابت شدہ فریضہ کو کیسے کالعدم کرسکتی ہے؟ (۲۰۱۶ء)

محکم فریضۂ شرعی کا انکار عصر حاضر کے نام پر



ماہنامہ "افکارِ ملی" ماہ ستمبر ۲۰۱۶ء نظر نواز ہوا۔ بقول یحییٰ نعمانی صاحب کے امت مسلمہ کے قائدین اور بڑے نامور مقبول علماء کی طرف سے طالبان، القاعدہ اور داعش کے کاموں پر شدید تنقید کی گئی جن کی وجہ سے امت کا عام دیندار طبقہ ان تنظیموں کی کارروائیوں سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن کیا اس کی وجہ سے شریعت کے ایک محکم فریضہ کو جس پر قرآن وسنت کے بیسیوں نصوص کی گواہی موجود ہے کالعدم، معطل یا منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ یحییٰ نعمانی صاحب اور ان کے ہمنوا عتیق الرحمن سنبھلی اور خالد سیف اللہ رحمانی نے جہاد کو اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد کالعدم اور منسوخ کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کسی کو اس سے بحث نہیں ہے کہ طالبان اور القاعدہ، داعش کے تعلق سے آپ لوگوں کے خیالات ونظریات کیا ہیں؟

اعتراض ہم کو تصور جہاد پر آپ لوگوں نے جو تیشہ چلایا ہے اس پر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ اس مسئلہ پر آیئے اور بتایئے کہ اگر نسخ جہاد کی جرأت قادیانیوں نے کی تو وہ غلط، بد دیانتی اور گمراہی تھی تو آپ لوگوں کا اقدام تصورِ جہاد پر خط نسخ کھینچنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ موجودہ دور کی جہادی تنظیموں کے وجود، ان کی سرگرمیوں سے برأت کا اظہار جس طرح آپ کررہے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہم آپ کے تصور جہاد کے خاتمہ کی کوششوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ یحییٰ نعمانی صاحب نے اس مسئلہ سے دامن بچا کر کچھ ضمنی باتوں کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ ان ضمنی باتوں میں بھی بہت کچھ قیل وقال کرنے کی گنجائش ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ یحییٰ نعمانی صاحب اور ان کے ہمنواؤں نے تصور جہاد کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ نہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیہم کترا رہے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ اس سوال کا جواب پہلے عنایت کریں پھر ضمنی باتیں اٹھائیں۔ مثلاً میں نے ان کے مضمون جنوری ۲۰۱۶ء پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یحییٰ نعمانی صاحب جہاد کی علت قتال کو بتاتے ہیں جب کہ جہاد کی علت حجاز میں کفر اور حجاز کے باہر غلبہ کفر ہے اور اس کی کچھ دلیلیں بھی دی تھیں۔ لیکن موصوف

نے اپنی وضاحت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جبکہ اس کی تصدیق یا تردید انہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کے بجائے ضمنی باتوں پر بحث چھیڑ کر تضییع اوقات کر رہے ہیں۔

عصر حاضر اور جہاد کے عنوان کا تقاضا تھا کہ یہ بتایا جاتا کہ عصر حاضر میں تصور جہاد کی کہاں تک گنجائش ہے اور اس کا صحیح طریقہ کیا ہو سکتا ہے اور پھر بتایا جاتا کہ موجودہ جہادی تنظیموں کی کون کون سے غلطیاں ہیں؟؟

بہر صورت یحییٰ نعمانی صاحب نے موجودہ مضمون میں جن باتوں میں الجھانا چاہا ہے ان میں سے چند پر ہم کچھ گفتگو کریں گے۔ یحییٰ نعمانی صاحب کہتے ہیں:

> ''ہاں یہ بات صحیح اور ہر ایک کے لئے واضح ہے کہ اس دور میں جہادی کوششوں سے مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کے بجائے نہایت پیچیدہ اور مشکل ہو گئے ہیں''۔

مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کا جہاں تک معاملہ ہے تقریباً کم و بیش ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کی بات اور تدبیریں ہو رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ سوال شدت سے اٹھا کہ مسلمانوں کے لئے کیا راہ ہے؟ ایک طرف دیوبند کی تحریک شروع ہوئی اس تصور کے ساتھ کہ مسلمانوں کی نجات اور فلاح کی راہ یہ ہے کہ پورے ملک میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا جائے۔ چنانچہ مدارس کا جال تحریک دیوبند کی بدولت پورے ملک میں بچھا دیا گیا اور دن بہ دن اس میں وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے لیکن کیا مسلمانوں کے مسائل حل ہو گئے اور دشواریاں ختم ہو گئیں؟ اس سوال کے جواب میں شروع ہی سے ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ مدارس سے نہ مسائل حل ہوئے ہیں اور نہ حل ہوں گے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا خیال ہے کہ مسائل پیدا ہونے اور مسلمانوں کی دشواریوں میں اضافہ اور مسلمانوں کی تنزلی، پسماندگی کی اصل وجہ یہ مدارس ہیں کہ مدارس نے زمانہ کی ایجادات اور ترقیوں سے نہ صرف یہ کہ روکا ہے بلکہ ان کو خلاف ایمان مسلمانوں کو باور کرایا ہے۔ یہ ذہن ایسا نہیں ہے کہ چند لوگوں کا ہو بلکہ ہر طبقہ میں یہ ذہن پایا جاتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ دیکھ کر مدارس کو یکلخت بند کر دیا جائے اور اہل مدارس کو قصوروار ٹھہرایا جائے! اس موقع پر اس حالت کا تصور ذہن میں لایئے جبکہ مدارس نہ ہوتے تو مسلمانوں کا کیا ہوتا؟ ان کے دین و ایمان کی کیا حالت ہوتی؟

دوسری طرف ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ذہن پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اس میں مضمر ہے کہ مسلمان نئی تہذیب اور نظریات سے ہم آہنگی پیدا کریں اور نئی تعلیم کو اپنائیں۔ نئی تعلیم انگریزی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی میڈیم اسکول شروع کئے جائیں۔ چنانچہ سرسید مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور اس کام میں ملت کے دولت مند، زمین دار، جاگیر دار، ترقی یافتہ اور دانشور لوگوں نے بڑھ چڑھ کر

حصہ لیا اور یہ سلسلہ بہت زور وشور سے آگے بڑھا پورے ملک میں بے شمار انگلش میڈیم اسکول قائم ہوئے اور سرسید مرحوم کے اسکول کے سلسلہ کی کڑی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ جو عرصہ دراز سے کام کررہی ہے اوراس میں شک نہیں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نفع رسانی اور منفعت بخش ہونے سے کوئی انکارنہیں کرسکتا اوران گنت مجلّے اور کتابیں علی گڑھ کی تحریک پرشائع ہوچکے ہیں اورمسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا پوری دنیامیں مسلمانوں کے ایک کامیاب ادارے کی حیثیت سے ایک اونچا مقام ہےلیکن کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے پورے مسائل حل ہوگئے اورمسلمانوں کی پسماندگی، جہالت، زبوں حالی اورغربت ختم ہوگئی؟

اس نقطۂ نظر سے اب جائزہ لیا جائےتواس کا جواب نفی میں آئے گا۔اس لئے کہ اس تحریک کے عام لوگوں کی نظرمیں کامیاب ہونے کے باوجود سچر کمیٹی کے سروے کے مطابق مسلمان آج بھی سب سے زیادہ غریب ، پسماندہ اورناخواندہ قوم ہے۔ یہاں تک کہ دلتوں سے بھی پسماندہ ہیں۔کیااس صورتحال کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈیڑھ سوسال سے اس تحریک نے مسلمانوں کوکچھ نہیں دیا۔اس اعتبار سے یہ تحریک غلط تھی اورغلط ہےاوراس تحریک کے آغاز کرنے والےقوم کے مجرم ہیں اور یہ تحریک بےفیض تھی اس لئے کہ مسلمانوں کے مسائل اورمسلمانوں کی دشواریاں کم نہیں ہوئیں بلکہ بڑھتی ہی جارہی ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ دیکھیے کہ مسلمانوں کے مصائب اوران کےحل کرنے کی غرض سےتحریک پاکستان چلی یہاں تک کہ ملک تقسیم ہوگیا اور پاکستان ایک مسلم مملکت کے نام سےوجود میں آیا اوراس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کو بےشمارمصائب، تباہیوں، بربادیوں اورجانی اور مالی بڑی آفتوں سے گزرنا پڑااورتقریباً پون صدی قیام پرگزرچکی ہےلیکن کیامسلمانوں کے مسائل حل نہیں توکم ہوئے ہیں؟ اورمسلمانوں کی جانی اور مالی بربادیوں میں کمی ہوئی ہے یا زیادتی؟

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا سوال ہے، ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک کوئی جہادی تحریک نہیں تھی لیکن ہزاروں خونریز فسادات ہوئے اورتھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعدمسلمانوں کی بربادیوں کی کہانی سننے اوردیکھنے میں آتی رہی۔آخراس کی کیا وجہ ہے؟ بہرصورت تباہیاں اور بربادیاں مسائل اوردشواریاں ہمیشہ کی چیزیں ہیں۔کسی ایک تنظیم، پارٹی اورتحریک کواصل وجہ قراردینامشکل ہے،اور جہاں تک صحیح اورغلط ہونے کا سوال ہےاس کا معیارمسائل کےحل ہونے یاحل نہ ہونے کونہیں بنایا جاسکتا ہے۔صحیح اورغلط ہونے کا معیار وہ میزان اورکسوٹی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن میں بتائی ہے۔مثلاً تحریک دیوبند اورتحریک علی گڑھ کون صحیح راہ پرتھی اورکون غلط۔اس کوقرآن کی بتائی ہوئی میزان پر پرکھنا ہوگا۔لہٰذا یحییٰ نعمانی

صاحب کا دنیوی نفع اور نقصان کی بنیاد پر صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا اصولی حیثیت سے غلط اور نامناسب ہے۔ جہاں تک فائدے اور نقصان کا تعلق ہے ہر چیز میں کچھ فائدہ اور کچھ نقصان ہوتا ہے، اسی طرح ہر تحریک کے کچھ فائدے اور نقصان ہوتے ہیں لیکن اس فائدے اور نقصان کی بنیاد پر غلط اور صحیح کا فیصلہ کرنا ایک مسلمان کا کام نہیں ہے۔ چہ جائیکہ کوئی صاحب علم وتقویٰ شخص یہ کام کرے۔

بنیادی غلطی

یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

''جہاد کے جواز کے لئے حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کی توقع شرط ہے''۔

یہ شرط یحییٰ نعمانی صاحب کی اپنی خودساختہ شرط ہے اور ان کے اپنے گمراہ ذہن کی اُپج ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کی کوئی دلیل نہ قرآن وسنت سے نہ فقہ سے پیش کی ہے۔

سورۃ الانفال، آیت نمبر ۶۰ سے ۶۵ تک دیکھ لیجئے، جہاد کے سلسلہ میں ابھارنے کا ذکر ہے اور جہاد کی تیاری کرنے کا حکم ہے لیکن حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج نکلنے کی شرط کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اشارۃً جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ نتائج کی پرواہ نہ کرو، اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ اسی طرح سے سورۃ الصّف میں یہ کہا گیا:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ. (الصّف:۴)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں بنیان مرصوص ہوکر کے لڑتے ہیں۔

البتہ خوشخبری جنت کی اور اچھے نتائج کی دی گئی ہے۔ قرآن میں حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کی شرط جہاد کے جواز کے لئے نہیں ملے گی۔ اور کہیں یہ نہیں ملے گا کہ اچھے نتائج کی توقع ہو تو جہاد کرو۔ اور توقع نہ ہو تو ہاتھ روکے رکھو بلکہ ہر جگہ یہی کہا گیا ہے کہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جنگ وجہاد کرو۔ اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لئے حالات کی پرواہ کئے بغیر اللہ کے راستے میں جان ومال کے ذریعہ جہاد کرو۔

آیات جہاد ایک ایک کو دیکھ لیجئے کہیں بھی حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کو شرط نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اچھے نتائج پیدا ہونے سے پہلے جو جہاد کرے گا اس کے برابر کوئی نہ ہوگا۔ "لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ" (الحدید:۱۰)

مطلب یہ ہے کہ جتنے زیادہ حالات ناسازگار ہوں گے، اتنا ہی مجاہدین کا درجہ بڑا ہوگا اور جہاد درحقیقت ناسازگار حالات میں یعنی جبکہ کفر کا رواج ہو اور کافروں کا اقتدار ہو انہی حالات میں جہاد جائز نہیں واجب ہوتا

ہے جواز کا کیا سوال؟ اور قرآن نے کہا کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ تمہاری سمجھ سے حالات کی سازگاری اور ناسازگاری جہاد کے جواز یا وجوب کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اللہ کا حکم ہر چیز پر بالا ہے۔ غرض حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کو شرط بنانا ایک بڑی گمراہی ہے۔ کم سے کم قرآن اور حدیث سے اس شرط کا ثبوت ملنا ناممکن ہے۔ فقہ میں جبکہ تمام فرائض وواجبات کی شرائط اور آداب مرتب شکل میں موجود ہیں وہاں بھی یہ شرط مفقود نظر آتی ہے۔

حالات کی ناسازگاری اس دور کی کوئی خصوصیت نہیں ہے تمام انبیاء علیہم السلام اور خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی میں دعوت و جہاد کے لئے حالات ناسازگار رہے۔ حالات کی ناسازگاری میں ہی بندے کا اصل امتحان ہوتا ہے اور اس کے لئے بلندی درجات کا موقع ہوتا ہے۔

یحییٰ نعمانی صاحب نے گویا یہ قسم کھا رکھی ہے کہ صحیح یا غلط جہاد سے بچنے کیلئے شرائط پیش کرتے رہیں گے۔ اس سے پہلے انہوں نے بڑے طنطنے کے ساتھ جہاد کیلئے امام کی شرط پیش کی تھی۔ لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ امام کی شرط فرضیت جہاد کے لئے نہیں ہے تو انہوں نے ایک نئی شرط اپنی طرف سے ایجاد کر کے پیش کی ہے۔

یحییٰ نعمانی صاحب کہتے ہیں:

''جہادی اقدام سب سے زیادہ موقع محل اور حالات واستطاعت کا پابند ہے۔ قرآن نے صاف کہا تھا کہ جب تک اچھے نتائج کی قابل لحاظ امید نہ ہو اس وقت تک مظالم پر صبر کر کے ہاتھ روکے رکھنا اور اقامت صلوۃ ہی وقت کا جہاد ہے۔''

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ.

مگر ہم نادان اپنے وقت کے جہاد کے بجائے دوسرے وقت کے عمل کو جہاد سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے ان لوگوں کے جہاد کو الٹے نتائج پیدا کرنے والا بنا دیا ہے۔ کوئی یہ کہہ کر آنکھیں نہ موند لے کہ اوپر کی آیت میں مذکور یہ حکم تو مکی عہد کا ہے اس لیے کہ مکی عہد بھی کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی ''محکم شریعت'' ہے۔''

یحییٰ نعمانی صاحب کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ مکی دور مسلمانوں کی کمزوری اور مغلوبیت کا دور تھا اور اس کمزوری اور مغلوبیت کے دور میں "کُفُّوۡۤا اَیۡدِیَکُمۡ" کے مطابق عمل کریں اور جہاد کی بات نہ کریں اور مزید کہا کہ مکی شریعت کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی محکم شریعت ہے ان جملوں پر غور کیا جائے تو ایک بہت بڑے فتنہ کی بات سامنے آئے گی۔

غالباً محکم شریعت کا لفظ لکھتے وقت یحییٰ نعمانی صاحب کو اس کی نزاکت کا خیال نہیں رہا۔ یعنی کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی محکم شریعت وہ شریعت ہے جو مکہ کی ہے۔ اس طرح بات یوں بنتی ہے کہ چونکہ ہم کمزوری اور مغلوبیت کے دور میں ہیں اس لئے کمزوری اور مغلوبیت کے دور یعنی مکی عہد کی شریعت کو اپنانا چاہئے اور مکی شریعت محکم ہے۔ محکم شریعت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ محکم شریعت وہ ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھئے جہاد ہی نہیں اکثر و بیشتر احکام مدنی دور میں آئے ہیں۔ یعنی مکہ کی "محکم شریعت" میں وہ احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح جب آپ آگے بڑھیں گے تو اکثر و بیشتر احکام کو چھوڑنا پڑے گا۔ مثلاً آپ کو تیمم کے حکم کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ اس لئے کہ مکی شریعت میں تیمم کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح کمزوری اور مغلوبیت کے دور یعنی مکی دور میں شراب حرام نہیں تھی۔ مکی دور میں جمعہ کی نماز نہیں تھی۔ مکی دور کے بیشتر حصے میں صرف دو رکعت کی نماز تھی اور پانچ وقت کی نماز ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے فرض ہوئی پھر دیکھئے مکی دور کی شریعت میں قبلہ بیت المقدس تھا کعبۃ اللہ کا ذکر مکی شریعت میں نہیں تھا۔ پھر مکی شریعت میں نماز میں سلام کلام جائز تھا یہاں تک کہ سلام کلام کے جواز کا تذکرہ مدنی دور میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح بیشتر سماجی، معاشرتی، عائلی، تجارتی، بیع وشراء، سیاسی اور بین الاقوامی جیسے مسائل سے متعلق احکام مکی شریعت میں نہیں آئے تھے۔ اسی طرح روزہ، زکوۃ، حج سے متعلق احکام مکی شریعت میں نہیں آئے تھے۔ یحییٰ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ نہیں نہیں ہم صرف جہاد کی بات کرتے ہیں تو ان کی بات کیوں کر تسلیم کی جائے گی؟!

یحییٰ صاحب کے بقول......

"جبکہ کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی شریعت مکی دور کی شریعت ہے اور وہ محکم شریعت ہے۔"

کسی کو کیا اختیار ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ صحیح بات یہ ہے کہ احکام شریعت میں مکی اور مدنی دور کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی بلکہ امور اور مسائل میں اصل یہ ہے کہ جو حکم آخر میں آتا ہے اس کو لیا جاتا ہے اور اس کا اعتبار ہوتا ہے۔ مثلاً حرمت خمر کا حکم ایک تو مکہ میں نہیں آیا تھا اور دوسرے مدینہ میں حکم آیا تو بتدریج آیا کوئی نومسلم یہ نہیں کہہ سکتا کہ مکہ کے لوگ ایمان لانے کے بعد تیرہ سال تک شراب پیتے رہے۔ میں بھی ایمان قبول

کرنے کے تیرہ سال بعد تک شراب پیتا رہوں گا۔ اسی طرح ایمان لانے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شراب کی حرمت بتدریج آئی ہے، میں شراب پینا بتدریج چھوڑوں گا۔ اس لئے کہ وقت اور زمانہ کی قید کے بغیر جب حرمت کا حکم آ گیا تو اس حرمت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ اسی طرح کسی ملک کے مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ جہاد کا حکم آغاز وحی کے پندرہ سال بعد آیا ہے اس لئے ہماری مملکت پر پندرہ سال گزر جائیں گے تو ہم جہاد کی طرف متوجہ ہوں گے۔

غرض یہ کہ اعتبار حکم آنے کا ہے، جب حکم آ گیا تو وہ حکم لاگو ہو جائے گا۔ ہر حکم کے لاگو ہونے کی شرائط اور آداب الگ الگ ہیں۔ یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں ''قرآن نے حکم دیا تھا کہ جنگی پوزیشن کا خیال رکھا جائے گا''۔

پھر آگے موصوف نے سورۃ الانفال کی ۶۵ اور ۶۶ آیات درج کی ہیں اور اس کے بعد بتایا ہے کہ آج مسلمان اور غیروں میں تعداد کے علاوہ ٹیکنالوجی کی شکل میں جو طاقت سامنے آئی ہے اس کی وجہ سے فرق بہت زیادہ ہو گیا ہے، نیز ظاہر ہے ایمانی قوت کا جہاں تک حال ہے آج کے فسق و فجور اور بے ایمانی و نفاق کے دور میں عہد صحابہ سے اچھے حال کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

آگے یحییٰ نعمانی صاحب کہتے ہیں:

> ''اس زمانہ میں مسلمانوں کا اور جن کے خلاف یہ مجاہدین جنگ کر رہے ہیں فرق بلا مبالغہ ایک اور سینکڑوں کا ہے۔ اس کو نظر انداز کرنا قرآنی ہدایت کی خلاف ورزی ہے جو چاہے اچھے جذبے ہی سے ہو''

اوپر نعمانی صاحب کے آخری دو جملے ہم نے نقل کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمانی صاحب نے سورہ انفال کی ۶۵ اور ۶۶ آیتوں کو بالکل سمجھا ہی نہیں۔ نیز یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر رازی جیسی عربی تفاسیر تک ان کی رسائی نہیں ہوئی ہے اور اردو کی تفسیروں پر بھی ان کی نظر بالکل نہیں ہے اس سلسلہ میں ہم آگے اردو کی دو تفسیروں کا حوالہ پیش کریں گے۔

سورۃ الانفال کی ان دو آیتوں میں کیا کہا گیا ہے یہ ایک سوال ہے؟ اس کو عام طور سے لوگ ایک اطلاع و خبر یا زیادہ سے زیادہ ایک پیشین گوئی سمجھتے ہیں۔ تفسیر رازی وغیرہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کلام کا انداز اور صیغہ ضرور خبر کا ہے لیکن معنی کے لحاظ سے امر ہے اور بعض دوسری جگہوں پر بھی صیغہ خبر کا ہے لیکن معنی امر کا مقصود ہے۔ مثلاً سورۃ الصّف میں ''تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ'' اگرچہ صیغہ خبر کا ہے لیکن معنی کے لحاظ سے امر ہے۔

اس لئے آگے امر کے جواب میں مضارع مجزوم ''یَغْفِرْ لَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ'' آیا ہے۔

بہرصورت اگر یحییٰ نعمانی صاحب کی بات مانی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیشتر اسلامی غزوات میں قرآنی ہدایات کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ غزوۂ بدر میں جنگی پوزیشن کا خیال نہیں کیا گیا اور "فَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ" (سورۃ الانفال:٦٦) کا لحاظ نہیں کیا گیا اور اپنے سے تین گنا طاقت سے مسلمان ٹکرا گئے ۔اسی طرح غزوۂ احد میں چار گنا طاقت سے مسلمان ٹکرائے۔ پھر غزوۂ موتہ میں تقریباً ستر گنا سے بھڑ گئے جو یحییٰ نعمانی صاحب کے نظریہ کے مطابق نعوذ باللہ قرآنی ہدایت کی خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح بہت سے غزوات میں دوگنا قوت سے بڑھ کر متصادم ہوئے۔ تعجب ہے کہ نعمانی صاحب کو غزوات کی کیفیت نے بھی یہ لکھنے سے نہیں روکا اور لکھ دیا کہ فرق کو نظر انداز کرنا قرآنی ہدایات کی خلاف ورزی ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ سورۂ انفال کی آیات میں جو حکم دیا گیا وہ یہ ہے کہ دس گنا طاقت سے لڑنا تم پر فرض ہے۔ پھر بعد والی آیت میں یہ کہا گیا کہ وہ پہلا حکم اٹھالیا گیا دوگنا طاقت سے لڑنا فرض ہے۔ یعنی ٹکرانے کی آخری حد بتائی گئی ہے جس کے مقابلے سے بھاگنا حرام ہے۔ رہا یہ کہ تین گنا، چار گنا، دس گنا اور ستر گنا اور سو گنا سے بھڑ جانے کا کیا حکم ہے، اس کی کوئی حد نہیں بتائی گئی ہے۔ صرف ترغیب دلائی گئی اور ابھارا گیا ہے، ہم اپنی اس بات کے لئے اردو کی تفسیروں کے دو حوالے پیش کرتے ہیں:

> ''بناء علیہ'' خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مومنین کو اپنے سے دس گنا دشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے لڑنا چاہئے۔ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھائیں۔''
>
> ''۲۰ اور ۱۰۰ دو عدد شاید اس لئے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اس لئے سریہ کم از کم سَو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا۔ دونوں آیتوں میں بیان نسبت کے وقت اعداد کا تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی۔
>
> بخاری میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ گذشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری "اَلۡـئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ" یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھالیا۔ اب صرف اپنے سے دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے۔''
>
> حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنا کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے تب یہی حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرتؐ کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ غزوۂ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد اللہ بھری پڑی ہے۔'' (تفسیر عثمانی)

حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں:

''لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے وقت میں ہزار مسلمان اَسّی ہزار سے لڑے ہیں۔'' (موضح القرآن)

یحییٰ نعمانی صاحب اپنی باتوں کی دلیل میں غزوۂ خندق کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس سلسلہ میں خود رسول ﷺ کا اسوہ موجودہ دور کے جہادی نظریات کے عین خلاف ہے۔ اس طرزِ عمل کا ایک موقع غزوۂ خندق کا ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کے پاس خبر آئی ہے کہ مدینہ پر مشرکین کا حملہ ہونے والا ہے ان کے لشکر کی تعداد دس ہزار ہے۔ ادھر جانثار مخلص صحابہ کی تعداد تین ہزار سے متجاوز ہے۔ طاقت کے اس فرق کی وجہ سے آپ ﷺ نے جنگ سے پہلوتہی فرمائی اور مقابلہ کے بجائے خندق کھود کر محصور ہو کر بیٹھ رہنے کو ترجیح دی۔''

پھر آگے لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ اس پر بھی تیار تھے کہ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے مشرکین کے بعض گروہوں کو مدینہ کی آدھی پیداوار ہر سال دینے کا معاہدہ کر لیا جائے۔''

❁ پہلی بات تو یہ ہے کہ (باب غزوۃ الخندق بخاری) کے حوالہ سے یحییٰ نعمانی صاحب نے جس بات کو خاص طور سے پیش کیا ہے مدینہ کی آدھی پیداوار ہر سال بعض گروہوں کو دے کر معاہدہ کر لیا جائے اولاً تو بخاری میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ طاقت کے اس فرق کی وجہ سے آپ نے جنگ سے پہلوتہی فرمائی اور مقابلہ کے بجائے خندق کھود کر محصور ہو کر بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ اس جملہ میں دو باتیں کہی گئی ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ جنگ سے پہلوتہی اس کو کیسے کہا جا سکتا ہے؟ خندق کا کھودنا جنگ سے پہلوتہی ہے یا جنگ کی نئی تکنیک ہے۔ دوسری بات محصور ہو کر بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ بیٹھے رہنے کی بات سے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ گویا مسلمان مایوس ہو کر یا سہم کر بیٹھ گئے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خندق کے پاس مسلمان مسلسل تعینات رہے۔ ایسے نازک حالات میں کسی گروہ کے متعلق عقلاً یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ بیٹھے رہیں گے چہ جائیکہ مسلمان۔ مسلمان خاموش بیٹھے نہیں رہے اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ کئی صحابہ اور خود نبی ﷺ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں۔ یعنی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی خندق پر غافل نہیں رہے۔ مستعدی اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ نماز کے وقت کی بھی انہوں نے پرواہ نہیں کی۔

❁ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ ایک مشہور پہلوان کسی طرح سے خندق پار کر کے آ گیا جس سے حضرت علیؓ کی زبردست لڑائی ہوئی، آخر میں حضرت علیؓ نے اس کا کام تمام کیا۔

❁ تیسرا ثبوت یہ ہے کہ برابر دونوں طرف سے تیر اندازی ہوتی رہی جس میں چھ مسلمان شہید ہو گئے اور مشرکین کے تقریباً دس لوگ مارے گئے جس میں بعض تلوار سے بھی قتل کئے گئے۔

یہ تین باتیں اس بات پر دلیل ہیں کہ جنگ سے پہلو تہی کرنے کی بات اور مسلمانوں کے محصور ہو کر بیٹھے رہنے کی بات سراسر غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشرکین کے بعض گروہوں کو آدھی پیداوار مدینہ کی ہر سال دے کر معاہدہ کرنے کے لئے تیار تھے ''ہر سال'' کے الفاظ یحییٰ نعمانی صاحب کے ہیں۔ فتح الباری اور سیرت کی دیگر کتابوں میں ''ہر سال'' کا لفظ نہیں ہے اور بخاری شریف میں اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حالات بہت نازک ہو گئے اور تقریباً ایک ماہ گزر گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ جنگی حکمت عملی اپنائی کہ دشمن کے اندر پھوٹ ڈال دی جائے۔ ظاہر ہے اس سلسلہ میں کئی تجاویز آئی ہوں گی جس میں ایک بات یہ تھی کہ بنو غطفان کے قبیلہ کو لالچ دے کر پہلے یہاں سے ہٹایا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ مشرکین کے حملہ کی خبر کے ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے مدینہ کی پیداوار مشرکین کو دے کر جنگ ٹال دیئے جانے کی کوشش کی گئی ہو اور اس موقع پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کا تذکرہ انصار کے لوگوں سے کیا صرف اس لئے کہ انصار کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عندیہ معلوم کرنا چاہتے تھے اس سے پہلے بھی اہم اور نازک موقع پر خصوصی طور پر انصار کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عندیہ معلوم کیا، کسی اقدام سے پہلے۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ سے اس تجویز کے بارے میں مشورہ کیا تو ان دونوں نے بیک زبان عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ محض ہماری خاطر ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جب ہم لوگ اور یہ لوگ دونوں شرک و بت پرستی پر تھے تب تو یہ لوگ ایک دانے کی بھی طمع نہیں کر سکتے تھے تو بھلا اب جبکہ اللہ نے ہمیں ہدایت اسلام سے سرفراز فرمایا ہے اور آپ کے ذریعہ عزت بخشی ہے ہم انہیں اپنا مال دیں گے؟ واللہ ہم تو انہیں صرف اپنی تلواریں دیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کی رائے کو درست قرار دیا۔

دشمن کے گروہوں میں پھوٹ ڈالنے کی حکمت عملی حضرت نعیم بن مسعودؓ کے ذریعہ کامیاب ہوئی، جنہوں نے بنو قریظہ اور قریش و غطفان کی صفوں میں پھوٹ ڈال دی جس سے ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔

چنانچہ مشرکین کی صفوں میں پھوٹ پڑ جانے اور بددلی و پست ہمتی سرایت کر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر نصرت کی ہوائیں بھیج دیں اور فرشتے بھیج دیئے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلامی تاریخ کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ ''احزاب'' میں جتنی بڑی طاقت کفار کو فراہم ہو گئی تھی اس سے بڑی طاقت فراہم کرنا عربوں کے بس کی بات نہ تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احزاب کی واپسی کے بعد فرمایا:

الان نغزوھم ولا یغزونا نحن نسیر الیھم۔ (صحیح بخاری: ۵۹۰/۲)

ترجمہ: اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے وہ ہم پر چڑھائی نہ کریں گے اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔

(۲۰۱۶ء)



مولانا خالدسیف اللہ رحمانی اورتصورِ جہاد



جناب مولانا خالدسیف اللہ رحمانی صاحب نے مولانا یحییٰ نعمانی صاحب کی کتاب ''جہاد کیا ہے'' پر پیش لفظ تحریر فرمایا ہے جس میں جہاد کے تعلق سے ایسی بات لکھ دی ہے جس کو اصطلاحی لفظوں میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ جہاد اس دور میں یا تو منسوخ ہے یا پھر معطل۔ اس کے علاوہ بھی کئی باتیں غیر متوقع طریقہ پر خلاف حقیقت آگئی ہیں۔ جس کے مقابلے میں حق اور حقیقت کو واضح کرنا ہم ایک دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ذیل میں ان کی عبارت نقل کی جاتی ہے اس کے بعد ہم اپنا تبصرہ درج کریں گے۔

''**فتح مکہ کی مہم کی اصل غرض:**

> حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ''جہاد'' ایک منفرد لفظ ہے جو فوج کشی کے لئے استعمال کیا گیا ہے، تا کہ مسلمان اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ یہ زر، زمین اور جاہ و اقتدار کے حصول کی جنگ نہیں ہے، جو عام طور پر کی جاتی ہے، بلکہ یہ عدل وانصاف قائم کرنے اور ظلم وفساد کو دفع کرنے کے لئے کی جانے والی ایک منظم کوشش ہے، جس میں قتل وقتال کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ خواہ مسلمان کو عدل فراہم کرنے کے لئے ایسی کارروائی کرنی پڑے، یا غیر مسلموں کو انصاف دلانے کے لئے۔ چنانچہ عہد نبویؐ میں جو سب سے بڑی مہم جوئی کی گئی وہ ہے فتح مکہ۔ یہ مہم اصل میں قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانے کے لئے تھی۔ جس کے مقابلہ میں مکہ کے مشرکین اور بنوبکر کے لوگوں نے عہد شکنی اور زیادتی سے کام لیا تھا۔ آپ ﷺ نے پہلے اہل مکہ سے ان کی دیت طلب فرمائی، لیکن جب وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور معاہدہ کے ختم کردینے کا اعلان کیا، تب آپ ﷺ نے مکہ پر فوج کشی فرمائی، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جہاد صرف مسلمانوں کو انصاف دلانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ پوری انسانیت کو انصاف دلانے کے لئے ہے۔''

جہاد بالسیف یا لفظِ قتال کو فوجی طاقت استعمال کرنے کا ہم معنی قرار دینا تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن مطلق لفظ ''جہاد'' کو فوج کشی کے ہم معنی قرار دینا کوئی اچھی تعبیر نہیں ہے۔ مولانا کی اوپر دی ہوئی عبارت میں فتح مکہ کی مہم کو اصل میں قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانے کے لئے کہنا ایک اہم اور واضح حقیقت سے رخ موڑنا اور اس کو نظر انداز کر دینے کے مترادف ہے۔ فتح مکہ کی مہم اصل میں کیا تھی؟ وہ کس غرض کے لئے تھی؟ وہ غرض اس کام سے ظاہر ہے جو آپ ﷺ نے مکہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کیا، یعنی پہلا کام جو آپ ﷺ نے کیا وہ ہے بیت اللہ کی تطہیر۔

کعبہ کے ارد گرد اور اس کے اندر ۳۶۰ بت تھے۔ آپ ﷺ نے ان بتوں کو ایک لکڑی سے گرانا شروع کر دیا، آپ ﷺ ان کو گراتے جاتے اور فرماتے: ''جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا'' حق آیا اور باطل مٹ گیا اور بے شک باطل مٹنے والا ہی تھا۔ باہر کے بتوں کو گرانے کے بعد آپ ﷺ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے اور اندر کے بتوں کو بھی آپ ﷺ نے نکال پھینکا اس کے بعد آپ ﷺ نے وہاں پر نفل نماز ادا کی۔ یہ سب کام کرتے کرتے نماز ظہر کا وقت آ گیا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال ؓ کو حکم فرمایا کہ وہ کعبہ کی چھت پر اذان دیں۔ حضرت بلال ؓ نے اذان دی اس کے بعد نماز ظہر ادا کی گئی۔

اس موقع پر وہاں موجود لوگوں کے سامنے آپ ﷺ نے جو ایک مختصر خطبہ دیا اس سے بھی صاف طور سے سمجھا جا سکتا ہے کہ فتح مکہ کی مہم کی اصل غرض کیا تھی۔ اس مہم کے ایک ہزار ایک فائدے گنائے جا سکتے ہیں مگر اصل غرض مرکز توحید کو شرک کی آلائش سے پاک کرنا تھا۔

مہم کی اصل غرض قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانا ہوتا تو ان کو انصاف دلانے کے بعد مکہ کو جیسا کہ وہ تھا اسی حالت پر آپ ﷺ چھوڑ کر چلے جاتے۔ کعبہ کی بتوں سے تطہیر اور مکہ سے مشرکین کو بالکل بے دخل کرنا اور مکہ پر پورا کنٹرول اور پھر اس کے ذریعہ پورے عرب کو اسلام کے زیر نگیں بنانا یہ کیونکر کیا جاتا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل غرض اور مقصد کچھ اور تھا، اصل غرض مشرکین کو انصاف دلانا نہیں تھی۔

اپنے حلیف بنی خزاعہ کو فائدہ پہنچانا ایک ضمنی کام تھا۔ اس موقع پر یہ بھی ذہن میں تازہ رکھنا چاہئے کہ مکہ پر چڑھائی کرنے سے پہلے معاہدہ کی تجدید کے لئے ابوسفیان اہل مکہ کے نمائندے کی حیثیت سے مدینہ آئے تھے اور تجدید معاہدہ کے لئے پوری کوشش کی تھی حضور ﷺ کے علاوہ حضرت ابوبکر ؓ، حضرت عمر ؓ، حضرت علی ؓ سے مل کر نئے سرے سے معاہدہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ حالات سابقہ بدستور باقی رہیں۔ حتیٰ کہ حضرت علی ؓ کے مشورہ کے مطابق اپنے طور پر یکطرفہ معاہدہ کی بحالی کا اعلان کر دیا مگر رسالت مآب ﷺ نے اس معاہدہ کو قبول نہ کیا

اور ابوسفیان کے اعلان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھکرا دیا۔ یہاں یہ ایک سوال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں کیا جبکہ ابوسفیان کی بات ماننے کی صورت میں بنوخزاعہ کو انصاف مل جاتا۔

مولانا لکھتے ہیں:

''دین میں مذہبی آزادی دینا: انصاف کا تعلق انسان کی جان سے بھی ہے، مال سے بھی اور عقیدہ وضمیر کی آزادی سے بھی، اسلام نے جیسے ہر شخص کے لئے جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا حق تسلیم کیا ہے، اسی طرح مذہبی آزادی بھی سبھوں کو عطا کی ہے، قرآن مجید نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اہل مکہ کو کہلایا: "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکافرون:٦) اور جیسا کہ قرآن نے اعلان کیا ہے: "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرۃ:٢٥٦) اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مشرکین اور اہل کتاب قبائل سے معاہدۂ امن کئے ہیں، ان مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا جو "صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ" کا ارتکاب کر رہے تھے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر قرآن بھی شاہد ہے، حدیث بھی اور سیرت کے واقعات بھی۔''

اوپر ہم نے ابھی مولانا کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں مولانا نے دو آیات قرآنی پیش فرمائی ہیں جو بالکل بے محل ہیں۔ پہلی آیت "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" اسلام کی دی ہوئی آزادی کے ثبوت میں پیش فرمائی ہے جبکہ اس آیت میں مشرکین سے اعلان براءت اور اظہار بیزاری کیا گیا ہے۔ رواداری، قومی یکجہتی، سیکولرزم اور وحدت ادیان کی بات نہیں کی گئی ہے۔ سورۃ الکافرون ہجرت کے کچھ قبل نازل ہوئی ہے۔ کفار کی تمام مصالحتی تجاویز کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھکرا دیا اور اس کے بعد براءت اور وارننگ کے طور پر کہا گیا "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" یہ بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام کی سنت رہی ہے اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تم اپنی جگہ خوش رہو، ہم اپنی جگہ خوش رہیں۔ اس کے ہم معنی سورۂ یونس کی آیت: ۴۱ ہے:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (یونس:۴۱)

ترجمہ: اور اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔

دوسری آیت "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" ہے۔ اس کا منشا اور مطلب کیا ہے؟ گہرائی میں جا کر سوچنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ شریعت میں "اِكْرَاهَ" تو صاف طور سے نظر آتا ہے۔ بچہ دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو مارنے کا حکم ہے، کوئی شخص مسلسل ترک صلاۃ کرتا ہے تو اسلامی قانون میں اس کی سزا کم از کم قید کی

ہے جب تک کہ وہ نماز کی ادائیگی کے لئے تیار نہ ہو، شرابی کی سزا ۸۰ کوڑے لگانا ہے۔ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس کے علاوہ تمام حدود وتعزیرات آخر کیا ہیں؟ فتح مکہ کے بعد متعدد افراد کو قتل کیا گیا پھر شریعت میں قتال کو فرض قرار دیا گیا۔ یہاں یہ کہنا کہ "لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" کی وجہ سے کئی قوموں سے معاہدہ کیا گیا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ معاہدہ کرنا کوئی فرض نہیں ہے۔ معاہدہ کی بنیاد دین وملت کی مصلحتیں ہیں۔ مصلحت کا تقاضا ہو تو معاہدہ ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ الغرض ان آیتوں سے مذہبی آزادی کے ثبوت میں استدلال کرنا محل نظر ہے۔ پھر بھی جہاد "صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ" کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ بحوالہ آیت قتال۔

مولانا لکھتے ہیں:

"غرض کہ اسلام کی نظر میں اصل امن وصلح ہے۔ قتال اس وقت ہے جب وہ امن وامان کو قائم رکھنے اور ظلم وفساد کو روکنے کے لئے مجبوری بن جائے، محض کفر کی بناء پر دنیا میں نہ صرف جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ عذاب الٰہی بھی کسی کافر گروہ پر اسی وقت نازل ہوا جب وہ کفر کے علاوہ اللہ کے راستہ سے روکنے کے بھی مرتکب ہوئے مگر افسوس کہ موجودہ دور میں جہاد کے لفظ کو دہشت گردی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اسے اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔" (جہاد کیا ہے؟)

اسلام میں صلح کا مقام

مولانا کے جو الفاظ ابھی ہم نے نقل کئے ہیں ان میں مولانا نے ایک نہایت غلط بات کہی ہے کہ صلح اور قتال میں صلح اصل ہے اور قتال عارضی ہے حالانکہ قتال کے بارے میں آیا ہے "کتب علیکم القتال" جیسا کہ "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" آیا ہے۔ گویا قتال ویسے ہی فرض ہے جیسے کہ صیام فرض ہے اور فقہ میں بھی قتال کو واجب بتایا گیا ہے اور قتال کے وجوب کو کسی شرط اور قید کے ساتھ مشروط اور مقید نہیں کیا گیا ہے اور صلح کو مشروط کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے: "وَإِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا" صلح کے اس امر کو کسی نے بھی وجوب کے لئے نہیں مانا ہے بلکہ صلح کرنے کا حکم دین وملت کی مصلحت پر موقوف ہے چنانچہ فقہ میں ہے:

"وإذا رأى الامام أن يصالح أهل الحرب أو فريقاً منهم و كان في ذلك مصلحة للمسلمين فلا بأس به". (هدایه، جلد۲، کتاب السیر)

ترجمہ: اور جب امام مناسب سمجھے کہ اہل حرب یا ان میں سے کسی گروہ سے مصالحت کرے اور اس میں مسلمانوں کے لئے مصلحت ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اس میں "لَا بَأْسَ بِهٖ" کے الفاظ سے زیادہ سے زیادہ اباحت اور جواز ثابت ہوتا ہے استحباب بھی ثابت نہیں ہوتا چہ جائیکہ وجوب۔

جہاد کے واجب ہونے کی صورت میں صلح کیونکر جائز ہے؟ صلح کو جائز ہی نہیں ہونا چاہیے تھا اس لئے صلح کے جائز ہونے کے لئے فقہاء کو یہ دلیل دینی پڑی کہ

"لأن الموادعة جهاد معنى إذا كان خير اللمسلمين" کیونکہ صلح حقیقت میں جہاد ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کے لئے بھلائی ہو۔

منع صلح اصل ہے اس کو سمجھنے کے لئے فقہ کی ایک اور عبارت پر غور کرنا اچھا ہوگا۔

"اختلف العلماء هل يجوز الصلح على أكثر من عشر سنين حجة المانعين إن منع الصلح هو الأصل بدليل أية القتال وقد ورد التحديد بالعشر فحصلت الإباحة بهذا القدر فبقى الباقي على الاصل". (حاشیہ ھدایہ جلد۲، کتاب السیر)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ متعینہ مدت زیادہ سے زیادہ دس سال کے لئے صلح کرنا ثابت ہے، لیکن کیا دس سال سے زیادہ مدت کے لئے صلح کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے تو جو لوگ کہتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ کے لئے صلح نہیں ہوسکتی وہ کہتے ہیں کہ عدم صلح اصل ہے، آیت قتال کی دلیل پر مگر دس سال کی مدت کے لئے صلح کا جائز ہونا ثابت ہے اور اس سے زیادہ نہیں ہے تو بقیہ اپنی اصل پر باقی رہے گا یعنی دس سے زیادہ والی بات اپنی اصل پر باقی رہے گی یعنی صلح جائز نہ ہوگی۔

قرآن کی ایک آیت دیکھیے:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ. (سورۂ محمد:۳۵)

ترجمہ: تو تم کمزور نہ پڑو اور صلح کی دعوت نہ دو تم ہی غالب رہو گے اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا۔

اس آیت میں صریح طور پر صلح کی دعوت دینے سے منع کیا گیا ہے لیکن مخالفین اگر دعوت صلح دیں تو اس دعوت کو قبول کرنے کی محض اجازت ہے۔

بہر صورت اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ صلح کی دین میں اجازت ہے صلح کو کسی طرح اصل نہیں قرار دیا جاسکتا کہ سورۂ محمد کی آیت میں "تَدْعُوْ" کو "فَلَا تَهِنُوْا" پر عطف کیا گیا۔ لفظ "لَا" کو دوبارہ نہیں لایا گیا ہے اس اسلوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "وَهْنٌ" کمزوری اور دعوت صلح دونوں کا منبع ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے منافقانہ ذہنیت۔ اس آیت میں یہی کہا جارہا ہے کہ تم بزدل بن کر صلح

اور سمجھوتہ کے داعی نہ بنو، بلکہ عزم و ایمان کے ساتھ جہاد کے لئے اٹھو، اللہ تمہارے ساتھ ہے تم غالب رہو گے تمہارے دشمن ذلیل وخوار ہوں گے۔

محض کفر کی بنا پر حکم جہاد

اوپر درج کی ہوئی مولانا کی عبارت میں دوسری غلط اور خلاف واقعہ بات یہ کہی گئی ہے کہ محض کفر کی بنا پر جہاد کا حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن یہ بات صریح حدیث کے خلاف ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

أُمرتُ ان أُقاتل الناس حتی یشهدوا أن لا إله إلا اللّٰه وأن محمدا رسول اللّٰه۔

اس حدیث سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی محض شہادت نہ دینے کی بنا پر دیا گیا تھا۔ اس میں ایچ پیچ نہیں ہے، نہ اس حدیث کے بارے میں کسی محدث یا کسی شارح حدیث نے کسی شک وشبہ کا اظہار کیا ہے البتہ اس حدیث کو اس زمانہ میں بعض لوگ آیت "یُعْطُوا الْجِزْیَةَ" کے معارض بتا رہے ہیں۔ یعنی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کرنے کی علت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت نہ دینا یعنی کفر ہے۔ جنگ اسی وقت ختم ہوگی جب لوگ کلمہ پڑھ لیں اور اس کے برخلاف آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ اس وقت ختم ہو جائے گی جب لوگ جزیہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں چاہے ان کا کفر باقی رہے۔ اس تعارض کو دور کرنے کے لئے بعض شارحین نے کئی تاویلیں کی ہیں مگر تعارض یوں ختم ہو جاتا ہے کہ جزیہ کی گنجائش اہل کتاب اور عجم کے مشرکین کے لئے ہے اس مسئلہ میں فقہاء میں کچھ اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ مشرکین عرب کے لئے جزیہ کی گنجائش نہیں ہے۔ (روح المعانی ۱۴/۵۹)

چنانچہ فتح مکہ کے وقت مشرکین مکہ کو جزیہ کا چانس نہیں دیا گیا۔ یہ بات صرف حدیث ہی سے نہیں قرآن سے بھی ثابت ہے۔ اس کے لئے سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۱۶ دیکھیے، چنانچہ صاحب تدبر قرآن نے اس پر سرخی جمائی ہے "مشرکین کیلئے دو ہی راہیں یعنی اسلام یا تلوار"۔ بعض حدیثوں میں جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دینے کی بات کی گئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

اوپر پیش کی ہوئی حدیث میں جس قتال کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف جزیرۃ العرب کے مشرکین سے ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب کی زمین پر کفر کا وجود برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لئے صرف اسلام یا تلوار ہے اور غیر عرب کے لئے اسلام، جزیہ اور تلوار کا چانس ہے تو کئی مسائل میں الجھنیں ختم ہو جائیں گی اور اگر یہ چیز ذہن میں صاف نہ ہو تو ذہنی الجھاؤ باقی رہے گا اور حدیث اور قرآن میں ٹکراؤ نظر آئے گا۔

توضع الجزیة علی اهل الکتاب والمجوس وعبدة الاوثان من العجم ولا

توضع علی عبدۃ الاوثان من العرب (قدوری، کذافی الھدایہ)

واضح رہے کہ عجم کے بت پرستوں سے بھی امام شافعیؒ کے نزدیک جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

مولانا رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

''مگر افسوس ہے کہ اس دور میں جہاد کے لفظ کو دہشت گردی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، اسے اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ کچھ غلط فہمی اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے جو احکام بیان کئے ہیں، وہ زیادہ تر اس عہد کے حالات پر مبنی ہیں، جس دور میں ہماری فقہی کتابیں مرتب کی گئیں، اس دور میں کوئی ایسا عالمی ادارہ نہیں تھا جو تمام ملکوں کو کسی معاہدہ کا حصہ بناتا اور سبھوں سے اس بات کی ضمانت لیتا کہ وہ ایک دوسرے کی سرحدوں میں مداخلت نہیں کریں گے اور ہر ملک دوسرے ملک کے اقتدار اعلیٰ کا احترام کرے گا، اس لئے اس وقت ہر ملک ایک طرح سے جنگ کی حالت میں ہوتا تھا اور اس کے پڑوسی کبھی بھی اس پر یلغار کر سکتے تھے، انسانی حقوق اور جنگی قیدیوں سے متعلق نہ کوئی قانون تھا اور نہ کوئی معاہدہ، ان ہی حالات کے پس منظر میں فقہاء نے فتاویٰ دیئے جو یقیناً اس وقت کے لئے مناسب تھے۔ آج کی دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے، اگرچہ کہ بڑی طاقتیں بہت سی دفعہ عالمی قوانین کا پاس ولحاظ نہیں رکھتیں، لیکن بہرحال ان کی ایک اہمیت محسوس کی جاتی ہے، یہاں تک کہ اکثر اوقات دنیا کی بڑی طاقتوں کو بھی اقوام متحدہ سے اپنے اقدامات کی حمایت حاصل کرنی پڑتی ہے، اس لئے آج قریب قریب تمام ہی غیر مسلم ممالک اور ان کے شہری عالم اسلام کے لئے معاہدین کا درجہ رکھتے ہیں نہ کہ حربیوں کا، اور حربی اور معاہد کے احکام ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں، یہاں تک کہ اگر غیر مسلموں کے کسی گروہ کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو اور اس ملک میں اندرونی طور پر مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی جائے تب بھی قرآن مجید کہتا ہے کہ ہمیں اپنے معاہدہ پر قائم رہنا چاہیے۔'' (التوبہ: ۴)

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے، سوچئے فقہاء نے جو احکام بیان کئے ہیں ان میں کتنے فیصلے احکام منصوص ہیں اور کتنے فیصد اجتہادی ہیں اور جو احکام ہیں کیا یہ صحیح ہے کہ اس عہد کے زیادہ تر حالات پر مبنی ہیں جس عہد میں فقہی کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ یہ دعویٰ ایسا دعویٰ ہے جو مولانا خالد صاحب رحمانی کو زیب نہیں دیتا، یہ فقہاء پر ایک الزام ہے۔ یہ دعویٰ پورے فقہی ذخیرہ کو بے اعتبار بنا دینے والا ہے، پوری عمارت کو ڈھا دینے والا ہے۔ فتاویٰ پر حالات کا اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ زیادہ تر حالات پر مبنی ہوتے ہیں بالکل غلط ہے۔ اسلامی قانون زیادہ تر کتاب وسنت اور آثار صحابہ سے ماخوذ اصولوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی فقہ اکیڈمی ہر کام سے پہلے فقہ کو ماضی کے وقتی اور زمانی اثرات سے بچانے کے لئے قرآن وسنت پر مبنی فقہی چیزوں کو الگ اور ممتاز کرنے کی کوشش کرے۔

یہ کہنا کہ جس دور میں فقہی کتابیں مرتب کی گئیں اس دور میں انسانی حقوق اور جنگی قیدیوں کے تعلق سے کوئی قانون اور معاہدہ نہیں تھا اور نراج کا دور تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی میں آمد ورفت کے نہ کوئی ذرائع تھے اور نہ ہی ٹرانسپورٹ کا کوئی سسٹم تھا۔ حالانکہ انسان ایک متمدن حیوان ہے انسانی تمدن ہمیشہ پایا گیا ہے۔ انسانی تمدن کی بنیادی چیزیں ہر دور میں پائی گئیں ہیں البتہ نوعیت اور معیار میں فرق رہا ہے۔ آج کوئی کام ہوائی جہاز اور موٹر سے لیا جاتا ہے وہی کام پہلے اونٹ، گھوڑا اور بیل سے لیا جاتا تھا۔ آج جو کام کاغذ سے لیا جاتا ہے کبھی پتھر، ہڈی اور لکڑی سے لیا جاتا تھا اسی طرح زندگی کے تمام شعبے میں کام ہوتا تھا۔ انسان کے اندر دوستی اور دشمنی، صلح وجنگ پہلے دن سے ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح صلح صفائی کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے اور ہر کام ہوتا رہا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ کسی دور میں انسانی اقوام جنگل کے جانوروں کے مانند تھے۔ انسان اور جانور کی فطرت ہمیشہ الگ رہی ہے ہاں معیار بدلتا رہتا ہے اور ترقی ہوتی رہتی ہے۔ فقہی کتابوں کے دور کو سراسر نراجی دور بتانا مبالغہ آمیز جھوٹ کہا جاسکتا ہے۔ فقہاء کے فتاویٰ کو ایک خاص زمانہ کیلئے مناسب بتانا کم وبیش ویسے ہی ہے جیسے روشن خیال لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بہت ترقی کر گیا، اسلام اس زمانہ میں چلنے والا نہیں ہے۔

"آج دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے۔"

یہ واقعہ کی نہ درست ترجمانی ہے نہ حقیقت کی صحیح تعبیر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج دنیا کے ہر ملک کو وقت کی جابر، ظالم اور استبدادی فرعونی طاقتوں نے ظلم کی ڈوری میں باندھ رکھا ہے بلکہ زیادہ صحیح ہے کہ اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھا ہے اور کمزور ممالک اور اقوام ان کا مشق ستم بنی ہوئی ہیں جب چاہا اور جس کو چاہا لڑا دیا اور جب چاہا صلح کرادی۔ بڑی پانچ طاقتوں کا راج نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ قانون۔ پوری دنیا ان کے مفاد کے تحت اٹھتی بیٹھتی ہے۔

غیر مسلم اقوام کو معاہدہ کے درجہ میں رکھ دیا ہے اور اس کے لئے کوئی وقت اور مدت کی تعیین بھی نہیں فرمائی ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک محکم فریضہ کو یا تو منسوخ کردیا، یا کم از کم معطل کردیا۔ دوسرے لفظوں میں ایک معتبر فقیہ نے اس کام کی توثیق اور تجدید کی ہے جو انگریز بہادر کے دور میں قادیانیوں اور بہائیوں نے کیا تھا، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ کام برٹش حکومت کے لئے کیا گیا تھا اور آج یہ کام امریکہ اور اس کے حلیفوں کے حق میں بظاہر کیا گیا ہے، نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ ورنہ بتایا جائے کہ معاہدہ کس نے کیا اور کب کیا؟ کون دو فریق تھے؟ مسلمانوں کا نمائندہ اور ذمہ دار کون تھا اور غیر مسلم دنیا کا نمائندہ کون تھا؟ معاہدہ افراد نہیں کرتے معاہدہ نمائندہ اور ذمہ دار کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ معاہدہ کا کہیں کوئی وجود نہیں ہے کم از کم ستر سال سے مسلمانوں کا کوئی

نمائندہ نہیں ہے۔ مسلمان کئی ملکوں میں محکومیت اور مغلوبیت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پچاس سے زیادہ ممالک میں حکمراں کی حیثیت سے تھے لیکن وہ دوسری بڑی طاقتوں کے غلام تھے۔ انہوں نے کبھی اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کیا وہ نام کے حکمران تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غلط بات کو ثابت کرنے کیلئے معاہدہ کا ڈھونگ رچایا گیا ہے اور ایک مفروضہ بنایا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی تشکیل کو ستر سال ہو رہے ہیں، دین کا ایک فریضہ ستر سال سے منسوخ یا معطل ہے۔ نہیں معلوم اقوام متحدہ کی کتنی عمر ہے۔ اگر اقوام متحدہ کی عمر آئندہ پانچ سو سال ہے تو آئندہ پانچ سو سال تک جہاد معطل رہے گا جبکہ فرضیت "كُتِبَ عَلَيْكُمْ" کے لفظ سے ثابت ہے۔

جہاد کی عظمت شان

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

الجهاد ماض مذ بعثني الله إلى أن يقاتل اٰخر أمتي الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل۔ (رواہ ابوداؤد، واحمد)

ترجمہ: جہاد جاری رہے گا میری بعثت سے لے کر یہاں تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرے گا، اس جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل منسوخ نہیں کر سکتا۔

راس الامر الاسلام وعموده الصلاة وذروة سنامه الجهاد
(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ: سب سے بڑی چیز اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔

لن يبرح هذا الدين قائما يقاتل عليه عصابة من المسلمين حتى تقوم الساعة
(رواہ مسلم)

ترجمہ: یہ دین برابر قائم و باقی رہے گا، اس پر مسلمانوں میں سے ایک گروہ قیامت تک جنگ کرتا رہے گا۔

لا تزال طائفة من امتي يقاتلون على الحق ظاهرين على من ناواهم حتى يقاتل اٰخرهم المسيح الدجال (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: میری امت میں سے ایک جماعت حق پر برابر لڑتی رہے گی اس حال میں کہ وہ اپنے دشمنوں پر غلبہ پائے گی حتی کہ میری امت کا آخری شخص دجال سے جہاد کرے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے:

ومن مات ولم يغز ولم يحدث به نفسه مات على شعبة من نفاق۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: اور جو شخص مرا اس حال میں کہ غزوہ نہیں کیا اور نہ دل میں اس کو سوچا وہ نفاق پر مرا۔

عن ابن عمرؓ سمعت رسول اللہ ﷺ یقول إذا تبایعتم بالعینة وأخذتم أذناب البقر ورضیتم بالزرع وترکتم الجهاد سلط اللہ علیکم ذلالاینزعه حتی ترجعوا إلی دینکم۔ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم جنس کے بازار میں آنے سے پہلے خرید وفروخت شروع کردوگے۔ اور گایوں کی دم پکڑلوگے اور زراعت پر راضی ہوجاؤ گے اور جہاد چھوڑ دوگے تو اللہ تم پر ایک ایسی ذلت مسلط کردے گا جس کو وہ نہیں ہٹائے گا اس وقت تک جب تک کہ تم دین کی طرف لوٹ نہ آؤ۔

قال ابن الهمام: ولا شک أن اجماع الامة أن الجهاد ماض إلی یوم القیمة لم ینسخ فلا یتصور نسخه بعد النبی ﷺ۔

ترجمہ: علامہ ابن ہمام نے فرمایا: بے شک امت کا اجماع ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا منسوخ نہ ہوگا، نبی ﷺ کے بعد اس کے منسوخ ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ونص الفقهاء أنه یجب علی الامام أن یقوم بالغزوة کل عام۔

ترجمہ: اور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ امام پر واجب ہے کہ ہر سال جنگ کرے۔

نص قطعی سے ثابت شدہ فریضہ پر چٹکی بجاتے ہوئے خط نسخ پھیرنا کتنی خطرناک بات ہے ہم کچھ زیادہ اس بارے میں نہیں کہنا چاہتے۔ اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ بفرض محال معاہدہ ہوگیا تو کیا ستر برسوں میں معاہدہ کو توڑنے والی کوئی چیز نہیں ہوئی؟ صلح حدیبیہ کا معاہدہ متعینہ مدت دس سال کے لئے ہوا تھا۔ بغیر تعیین مدت کے آپ نے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ حدیبیہ کا معاہدہ کیسے ختم ہوا؟ دیکھئے ابھی دوسال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ مشرکین کے ایک حلیف بنی بکر نے آپ ﷺ کے حلیف بنی خزاعہ کے کچھ آدمیوں کو ماردیا تھا، مارے جانے والے لوگ دس سے زیادہ نہیں تھے اس پر آپ نے معاہدہ ختم کردیا اور باوجود مشرکین کے تجدید معاہدہ کی مساعی کے آپؐ نے معاہدہ کو باقی رکھنے کے بجائے مکہ پر دس ہزار لشکر کے ساتھ چڑھائی کردی۔

اب دیکھئے آج جس معاہدہ کا ذکر چل رہا ہے اس پر ستر سال گزر چکے، اس طویل مدت میں کیا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو معاہدہ توڑ دے؟

صرف برصغیر ہندوپاک میں اس مدت میں لاکھوں مسلمانوں کی جانیں گئی ہیں۔ تقسیم کے وقت پنجاب اور نواکھالی میں کیا کچھ ہوا اس کا اس وقت اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں لوگوں کے کہنے کے مطابق کم ازکم دس ہزار فسادات پھر سقوط حیدرآباد کے موقع پر بڑی تعداد میں جانیں تلف ہوئیں۔ بابری

مسجد کی شہادت کے موقع پر بھی بڑے پیمانے پر پورے ملک میں جانی نقصان ہوا۔ ابھی چند سال پہلے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ ان سب واقعات کے تناظر میں معاہدہ پر کیا حکم لگایا جائے گا؟

پاکستان جیسا کچھ بھی رہا ہے پھر بھی ایک مسلم ملک تھا۔ لیکن بے انتہا خون خرابہ کے بعد دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ کشمیر کا مسئلہ کیا ہے؟ کیا حق ہے اور کیا ناحق؟ اس سے ہم بحث نہیں کرتے، لیکن خون مسلم کی ارزانی برابر دیکھی جارہی ہے۔ افغانستان میں بارہ سال سے ناٹو نے جو طوفان بدتمیزی روا رکھا ہوا ہے اور جان و مال کی جو بربادی ہم اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اس کا کوئی اندازہ ہے؟ کیا اس میں اقوام متحدہ شریک نہیں ہے؟

برصغیر کے علاوہ بوسنیا، چیچنیا، یوگوسلاویہ، کوسوو، اریٹریا، نائیجریا میں جو کچھ ہوا اس موقع پر معاہدہ کہاں گیا تھا؟ اور اقوام متحدہ کی وہ ڈوری کہاں گئی تھی جس ڈوری میں تمام دنیا کے ممالک بندھے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں عراق، لیبیا جو نام ہی کے صحیح مسلمان ملک تھے ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور جو جانیں گئیں اور جارہی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں۔ برما میں مسلمانوں پر جو گزری اس کا قصہ کوئی بہت پرانا نہیں ہے۔ اسی طرح افریقہ کے بعض ممالک میں مسلمانوں کی جو بربادی ہوئی ہے اس کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ مصر جو عرب ممالک میں ایک نمایاں اہمیت کا حامل ملک ہے اس میں نہتے لوگوں پر بمباری کی گئی اور ہزاروں کا قتل عام کیا گیا۔ شام میں اب تک ڈیڑھ لاکھ مسلمان ختم ہو چکے ہیں۔ اس طرح ایک محتاط اندازہ کے مطابق کم از کم بیس لاکھ مسلمان پوری دنیا میں ختم کئے گئے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کس نے ختم کیا؟ کون قصوروار ہے؟ اور کون بے قصور ہے؟ مسلمان تو مرے ہیں۔ اندازہ لگایا جائے کہ کیا اس تناسب سے دوسری اقوام کی جانیں بھی گئی ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں اقوام متحدہ کہاں تھی؟ اور جس معاہدہ کا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے ذکر کیا، کیا وہ ٹوٹا نہیں؟!

مسلمانوں کے ایک حلیف بنوخزاعہ پر بنی بکر نے زیادتی کی تو اللہ کے نبی ﷺ نے معاہدہ توڑ دیا۔ مگر مولانا رحمانی آج کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر زیادتی کی جائے تو قرآن کہتا ہے کہ معاہدہ کو باقی رکھنا چاہیے۔ قرآن نے یہ کہاں کہا ہے مولانا نے حوالہ دیا ہوتا تو اچھا تھا۔

(۲۰۱۸ء)



مولانا عنایت اللہ سبحانی کا نظریۂ جہاد



بیسویں اور اکیسوی صدی میں جہاد کا جتنا چرچا ہوا ہے اتنا چرچا تاریخ میں شاید کبھی نہیں ہوا تھا۔ افغانستان سے لے کر عراق اور شام تک غلط یا صحیح عملاً جہاد کا مظاہرہ ہوا ہے۔ بقیہ ساری دنیا میں تقریری اور تحریری تذکرہ ہوا ہے۔ جہاں زبانی اور تحریری جہاد کی تائید میں بولا اور لکھا گیا، وہیں جہاد کو کنڈم کرنے اور بے وزن کرنے کے سلسلہ میں بڑی کوششیں کی گئی ہیں، تاکہ مسلمانوں کے ذہن ودماغ سے جذبۂ جہاد اور شوق شہادت جو شعوری یا غیر شعوری طور سے موجود ہے ان کو نکالا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک تحریر مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب کی ہمارے سامنے ہے۔ تحریر دیکھنے کے بعد ہر کوئی اعتراف کرے گا کہ مولانا نے کافی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے اور سب سے الگ نکتے اور پوائنٹ نکالے ہیں۔ لیکن اتنی لمبی تحریر کا آغاز جادۂ حق سے ہٹا ہوا ہے، اس لئے تقریباً چار سو صفحے کی کتاب (جہاد اور روح جہاد) بے مقصد اور لاحاصل ہو کر رہ گئی ہے۔ مثلاً ایک انوکھا نکتہ نکالتے ہوئے موصوف تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہاں بات ذہن میں رہے کہ اسلام کا جہاد کسی مذہب یا کسی دھرم کے خلاف نہیں ہوتا۔''
>
> ''یہ مسلح جہاد جاہلیت کے خلاف نہیں تھا بلکہ ظلم اور استبداد کے خلاف تھا۔''
>
> ''یہ ان ظالموں سے ان کے نبیوں نے ان کے ظلم وجارحیت کی بناء پر جنگ کی۔ ان کے کفر وشرک یا ان کے نظام جاہلیت کی بناء پر نہیں کی۔''

یہ نکتہ جتنا انوکھا ہے اتنا ہی بے وزن اور بودا ہے۔ یہ بات کہہ کر مولانا سبحانی نے جہاد کی پوری روح نکال دی ہے۔ انوکھا اس لئے ہے کہ یہ بات اسلام کی پوری تاریخ میں کسی مفسر، محدث اور فقیہ نے نہیں کی ہے۔ اگر کسی نے کہی ہوتی تو سبحانی صاحب اس کا حوالہ ضرور دیتے لیکن اس کی تائید میں کسی آیت، کسی حدیث اور سیرت کا کوئی واقعہ موصوف نے نہیں پیش کیا، چنانچہ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل کتاب میں اس کی دلیل میں کوئی چیز ہمیں

نہیں ملی۔ اس طرح یہ پوری کتاب:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تاثریا می رود دیوار کج

اس شعر کے مصداق نظر آتی ہے۔

کتاب کی طوالت کی وجہ بھی یہی ہے کہ جیسے جیسے کتاب کی دیوار بڑھتی گئی ویسے ویسے اس میں کجی اور ٹیڑھ سامنے آتی گئی اور پھر لازماً اس ٹیڑھ کو مولانا سیدھی کرنے کی فکر کرنے لگے۔

ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ مکہ فتح ہونے اور مشرکین قریش کے ظلم واستبداد اور طاقت ختم ہونے کے بعد کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بتوں کو توڑنے کی کیا ضرورت تھی؟

مقصد تو اسی وقت حاصل ہو گیا تھا جب اہل مکہ نے سپر ڈال دی تھی۔ آخر انتہائی ذلت آمیز طریقہ پر بتوں کو مسمار کیوں کیا گیا۔ سیرت میں آتا ہے:

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے اور آگے پیچھے اور گرد وپیش موجود انصار ومہاجرین کے جلو میں مسجد حرام کے اندر تشریف لائے۔ آگے بڑھ کر حجر اسود کو چوما اور اس کے بعد بیت اللہ کا طواف کیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ایک کمان تھی اور بیت اللہ کے گرد اور اس کی چھت پر تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی کمان سے ان بتوں کو ٹھوکر مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل:۸۱)

ترجمہ: حق آ گیا اور باطل چلا گیا یقیناً باطل جانے والی چیز ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ (السبا:۴۹)

ترجمہ: حق آ گیا اور باطل کی چلت پھرت ختم ہو گئی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹھوکر سے بُت چہروں کے بل گرتے جاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طواف اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر فرمایا تھا اور حالت احرام میں نہ ہونے کی وجہ سے صرف طواف ہی پر اکتفاء کیا۔ تکمیل طواف کے بعد حضرت عثمان بن طلحہ کو بلا کر ان سے کعبہ کی کنجی لی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے خانہ کعبہ کھولا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو تصویریں نظر آئیں جن میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تصویریں بھی تھیں، اور ان کے ہاتھ میں فال گیری کے تیر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا: اللہ ان مشرکین کو ہلاک کرے۔ خدا کی قسم ان دونوں پیغمبروں نے کبھی بھی فال کے تیر استعمال نہیں کئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کی بنی ہوئی ایک کبوتری بھی دیکھی اسے اپنے دست مبارک سے توڑ دیا اور تصویریں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے مٹادی گئیں۔'' (الرحیق المختوم، صفحہ نمبر: ۶۳۲)

اور سبحانی صاحب لکھتے ہیں:

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت مدینہ سے پہلے قیام مکہ کے دوران میں جہاد کرنے کا حکم ہوا، یہ جہاد مشرکین مکہ سے کرنا تھا اور قرآن پاک کے ذریعہ کرنا تھا۔ فرمایا:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا○ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا○ (الفرقان: ۵۲،۵۱)

ترجمہ: اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے۔ پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔

یہاں آیت میں جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ہے کفار و مشرکین کو قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دینا، اس کے نور سے ان کے دل و دماغ کو منور کرنا، اس کے موتیوں سے ان کی زندگیوں کو آراستہ کرنے کی کوشش کرنا، وہ جاہلیت اور کفر و شرک کی جن برائیوں اور جن گمراہیوں میں مبتلا ہیں، ان سے انہیں نکالنے کی انتھک جدوجہد کرنا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ○ (العنکبوت: ۶)

ترجمہ: دین کی راہ میں جو بھی جدوجہد کرے گا، وہ خود اپنے لئے کرے گا، اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے بے نیاز ہے۔'' (جہاد اور روح جہاد، صفحہ ۳۸)

یہاں سوال یہ ہے کہ سبحانی صاحب نے اپنی اس تحریر میں جس جہاد کا ذکر اہل مکہ کے ساتھ قرآن کے ذریعہ کیا ہے وہ کس کے خلاف تھا؟ کسی مذہب کے خلاف نہیں تھا؟ کفر و شرک کے خلاف نہیں تھا؟؟ سبحانی صاحب نے اپنے دعوے پر یہاں کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ سلف صالحین میں سے کسی کا قول بھی نہیں پیش کیا ہے۔ البتہ چند آیتیں ضرور نقل کی ہیں جو کسی طرح ان کی تائید میں نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے بطور دلیل ان کو پیش کیا ہے۔ البتہ جو بھی ان آیتوں کو پڑھے گا وہ ضرور سوال کرے گا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں اپنے مخاطبین کے ساتھ جس کشمکش اور تصادم کا تذکرہ ملتا ہے اور جو جدوجہد، جانفشانی انہوں نے کی وہ کیا ان کے کفر اور شرک کے خلاف نہیں تھی؟؟

کیا کسی بھی نبی نے اپنے مخاطبین اور مدعوئین کے مذہب اور دھرم کی تائید میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالا

ہے اور کہا ہے کہ لوگو! ہم کو تمہارے مذہب اور دھرم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مثلاً دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام نے کیا دعوت دی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ ○ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ اِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (نوح:۲-۴)

ترجمہ: اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا، کاش تمہیں اس کا علم ہو۔

تو اس کے جواب میں قوم نے باہم ایک دوسرے سے کہا......

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ○ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ○ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (نوح:۲۳-۲۴)

ترجمہ: انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، اور تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔

اس سے تھوڑا آگے آتا ہے:

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ○ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ○ (نوح:۲۶-۲۷)

ترجمہ: اور نوح نے کہا: ''میرے رب! ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی کا تذکرہ ہے، ان کے درمیان اور مخاطبین کے درمیان جو مکالمہ بھی گزرا ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ نبی اور مخاطبین کے درمیان جو نزاع تھی اس کی وجہ کفر و شرک اور توحید الٰہ کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو دیکھیے کیا اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح سے بھی اس کی گنجائش رہتی ہے کہ کہا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی جد و جہد اور ان کا جہاد کسی مذہب اور دھرم کے خلاف نہیں تھا۔

سورۃ الممتحنہ کی ذیل کی آیت پڑھیئے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ. (الممتحنۃ:۴)

ترجمہ: تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک نمونہ ہے، اُنہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا، ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

یہ آیت ایک صراحت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جدو جہد خالصتاً توحید کی تائید میں اور کفر و شرک کے خلاف ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک دوسری صراحت دیکھئے:

قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۠ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

کیا اس طرح کی قرآنی آیات کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہے کہ جہاد کسی مذہب اور دھرم کے خلاف نہیں تھا اور شرک اور کفر کے خلاف نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کو یا یہ کہا جائے کہ اہل جہاد کو شرک اور کفر گوارا ہے اور شرک اور کفر کوئی نا قابل برداشت چیز نہیں ہے اور نہ قابل نفرت اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جس کو وجہ دشمنی اور وجہ عداوت بنایا جائے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بات سے ظاہر ہوتا ہے اس لحاظ سے سوچا جائے تو سبحانی صاحب کی بات نہایت ہی سنگین بات بن جاتی ہے اس لئے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے کفر اور شرک کو قابل نفرت چیز قرار دیا ہے اور کفر اور شرک سے بغض و عداوت کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور قرآن نے کفر کے بطن سے نکلی ہوئی چیزوں کو گندگی اور اہل کفر کو ایسا نجس کہا ہے کہ مسجد حرام کے قریب بھی انہیں آنے کی اجازت نہیں دی۔ اور مسجد حرام ہی نہیں اللہ کے رسول ﷺ نے پورے جزیرۃ العرب سے انہیں نکالنے کا حکم فرمایا۔

تعجب ہے کہ کتاب وسنت کا علم رکھنے والا شخص ایسے شرک اور کفر کو لائق، گوارا اور قابل برداشت چیز کہہ رہا ہے۔ پھر دیکھئے پوری تاریخ میں کیا کوئی ظالم اور مستبد ایسا گزرا ہے جس کا کوئی مذہب اور دھرم نہیں رہا ہو نیز کوئی ظالم اور جابر ایسا پیدا ہوا ہے جس نے دعوت توحید کو گوارا کیا ہو اور اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑا ہوا ہو؟ ہزاروں انبیاء علیہم السلام نے اپنی جدوجہد اور اپنا جہاد کیا ہمیشہ لامذہبوں کے خلاف کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاد ظلم اور استبداد کے خلاف ہوا ہے اور ہونا چاہئے جیسا کہ سورۂ حج آیت نمبر ۳۹۔۴۰ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ صرف ظلم کے خلاف جہاد ہے کسی دوسری برائی کے خلاف نہیں ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرة: ۱۹۳)

ترجمہ: تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہوجائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الانفال: ۳۹)

ترجمہ: (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو) ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوجائے، پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔

ان دو آیتوں پر غور کیجئے، اس سے معلوم ہوگا کہ جہاد دو چیزوں کے خلاف ہے۔ ایک فتنہ اور دوسرے دین کا اللہ کے لئے نہ ہونا، یعنی جہاد فتنہ کو ختم کرنے کیلئے ہوتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ دین اللہ کیلئے ہوجائے۔ دونوں باتیں ایک ہی ہیں جس کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ فتنہ سے مراد مفسرین نے شرک لیا ہے اور اس طرح پوری بات یہ ہوئی کہ قتال کی غرض دین کو قائم کرنے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی ہے جس کو قرآن کے الفاظ میں اظہار دین کہا گیا ہے۔ سبحانی صاحب نے ایک مقام پر کہا کہ ''اس آیت میں دین کا لفظ اصطلاحی معنی میں نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ اپنے لغوی معنی ''اطاعت'' میں استعمال ہوا ہے۔''

ہم کہتے ہیں کہ اس سے آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ یہ دین اللہ کے لئے ہوجانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری اطاعتیں اللہ کے لئے ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوگا جب سارا کفر اور شرک ختم ہوجائے یا شرک اور کفر کا غلبہ ختم ہوجائے۔ اسی صورت میں قرآن کی منشاء (یعنی اللہ کے لئے دین ہوجانے کی) پوری ہوگی۔

دراصل یہاں چار سوال ہیں جن کے صحیح جواب آنے کے بعد ہی حقیقت پوری طرح سمجھ میں آئے گی۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جہاد کس کی تائید میں ہوتا ہے یا یہ کہا جائے کہ جہاد کی کیا غرض ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جہاد کس چیز کے خلاف ہوتا ہے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ جہاد کس سے کیا جائے؟

چوتھا سوال یہ ہے کہ جہاد کس سے نہ کیا جائے؟

- پہلے سوال کا جواب اوپر ہماری ذکر کردہ سورہ بقرہ اور انفال کی آیات میں آ گیا ہے کہ جہاد کی غرض ساری اطاعتوں کو ایک اللہ کیلئے کر دینا ہے اور اطاعت کے جتنے دعویدار ہیں ان کو ختم کر دینا یا ان کو مغلوب کر دینا بتایا گیا ہے۔ اس کے بغیر ساری اطاعتیں اللہ کے لئے نہیں ہو سکتیں۔
- دوسرے سوال کا جواب بھی کسی قدر اس میں آ گیا ہے کہ غیر اللہ کی اطاعتوں کے خلاف جہاد ہوتا ہے یا یہ کہا جائے کہ جہاد فتنہ اور شرک و کفر کے خلاف ہوتا ہے۔
- تیسرے سوال کے جواب میں ہم سورہ توبہ کی چار آیتیں پیش کرتے ہیں۔

① وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ. (التوبۃ:۱۲)

ترجمہ: اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا اعتبار نہیں شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔

② يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ○ (التوبۃ:۷۳)

ترجمہ: اے نبی ﷺ، کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

③ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○ (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔

۴ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ قَٰتِلُوا۟ ٱلَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ ٱلْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا۟ فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلْمُتَّقِينَ ۝ (التوبۃ:۱۲۳)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جنگ کرو اُن منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

چاروں آیتوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جہاد تیسرے سوال کے جواب میں پورے طور سے واضح ہے کہ جہاد ائمۃ الکفر اور کفار و منافقین سے ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے سوال کا جواب بھی اس میں آتا ہے کہ جہاد کس چیز کے خلاف ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف سبحانی صاحب نے پہلے سوال کا جواب دلیل کے ساتھ کہیں نہیں دیا ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ جہاد ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ لیکن اس کی دلیل میں بھی کوئی آیت پیش نہیں کی۔ ہم نے اوپر جو گفتگو کی ہے اس میں چاروں سوالوں کے جواب بڑی حد تک آ گئے ہیں۔ سبحانی صاحب اور ان کے ہمنواؤں سے خواہش کریں گے کہ کفار و مشرکین اور منافقین کے علاوہ کسی سے جہاد کرنے کی کوئی ایک آیت پیش کریں۔

اسی طرح کفر و شرک اور منافقت اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والی برائیوں کے علاوہ کسی دوسری برائی کے خلاف جہاد کرنے کا کوئی اشارہ موجود ہے تو پیش کریں۔

الغرض کفر و شرک اور منافقت اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والی برائیوں اور منکرات کے خلاف جدوجہد اور جہاد کرنے کے شواہد قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی بھرے پڑے ہیں۔

بہرصورت یہ معمہ اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ سبحانی صاحب جیسا پڑھا لکھا آدمی یہ کیسے کہتا ہے کہ جہاد کفر و شرک کے خلاف نہیں ہوتا۔ غالباً سبحانی صاحب ان لوگوں سے متاثر ہیں جو مغرب کے اس تصور آزادی کے قائل ہیں جس آزادی کی حد یہ ہے کہ آدمی ننگے اور برہنہ رہنے کو اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔ نیز مرد اور عورت بغیر نکاح اور شادی کے ایک ساتھ رہنے کا حق رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ دو مرد بحیثیت میاں بیوی کے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں کسی کو کیا حق ہے کہ وہ ان کو اس سے روکے۔

یہ لوگ قرآن کی ایک آیت سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے ذیل میں ہم پیش کرتے ہیں۔

وَقُلِ ٱلْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۚ إِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (الکہف:۲۹)

ترجمہ: صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے، ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کررکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔

یہ آیت آزادی کا پروانہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک دھمکی ہے۔

(بحوالہ تفسیر جلالین اور تفسیر رازی۔)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ آزادی کا پروانہ ہے تو دنیا ہی میں انہیں کیوں آزادی کا فائدہ دیا جارہا ہے اور آخرت میں کیوں ان کے لئے اتنا سخت عذاب دیا جارہا ہے، یہ تو بڑا ظلم ہے۔ مغرب کے اس گروپ کے سوا قدیم مفسرین میں سے کسی نے اسے آزادی کا پروانہ نہیں قرار دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے نزدیک شرک اور کفر کے خلاف جہاد کیا جائے تو یہ فطری آزادی کے منافی چیز ہوگی۔ اس لئے کہتے ہیں کہ جہاد کفر اور شرک کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح کی چھوٹ اور آزادی کفار و مشرکین کے لئے یہ لوگ یہ بھی دیتے ہیں کہ دنیا میں کفار و مشرکین کے لئے کوئی سزا اور عذاب نہیں ہے۔ سبحانی صاحب کی اس بات کو ان کی دلیل کے ساتھ پڑھئے۔ سبحانی صاحب لکھتے ہیں۔

''حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے جب اس زمین کی طرف بھیجا، تو وہ جانتا تھا کہ ان کی اولاد میں دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔ اگر کچھ لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے اطاعت گزار اور فرماں بردار ہوں گے، تو بہت سے لوگ کفر و شرک کے علم بردار اور اس کے نافرمان ہوں گے۔ چنانچہ اسی وقت ان دونوں گروہوں کا انجام واضح کر دیا تھا۔ فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ○ (البقرۃ:۳۸-۳۹)

ترجمہ: ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یہاں کفر اور تکذیب آیات، یعنی اللہ تعالی کی ناشکری کرنے اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے کی اس دنیا میں کوئی سزا نہیں بتائی گئی ہے۔ کفر و شرک اور تکذیب آیات کی بنا پر نہ اس دنیا میں اللہ کا عذاب آتا ہے، نہ کسی مسلم سلطنت کیلئے یہ بات جائز ہے کہ کفر و شرک اور تکذیب آیات کو بنیاد بنا کر کسی قوم سے جنگ کرے۔ کفر و شرک اور

اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے کی سزا بس جہنم ہے جو آخرت میں سامنے آئے گی۔'' (جہاد اور روح جہاد، ص: ۷۷)

سبحانی صاحب کے الفاظ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آیت میں صرف اتنا دیکھ کر منکرین کے لئے جہنم ہے۔ دنیا میں ان کے لئے کوئی سزا اور عذاب نہ ہونے کا دعوی کر دیا۔ حالانکہ اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی دسیوں آیات میں یہ ذکر ہے کہ دنیا میں بھی کفر اور شرک کی سزا اور عذاب ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (التوبۃ:۱۴)

ترجمہ: ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل وخوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبۃ:۵۵)

ترجمہ: اِن کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اِنہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ○ (التوبۃ:۲۶)

ترجمہ: پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول ﷺ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔''

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ (التوبۃ:۷۴)

ترجمہ: اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آئیں تو انہی کے لیے بہتر ہے اور اگر یہ باز نہ آئیں تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْھَآ اِلَّا خَاۗىِٕفِيْنَ ڛ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (البقرۃ:۱۱۴)

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کے معبدوں (مساجد) میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہوا ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا أَوْ يُصَلَّبُوٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ ٱلْأَرْضِ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا وَلَهُمْ فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (المائدۃ:۳۳)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں، یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ ءَامَنَتْ فَنَفَعَهَآ إِيمَٰنُهَآ إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّآ ءَامَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ ٱلْخِزْىِ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَمَتَّعْنَٰهُمْ إِلَىٰ حِينٍ ۝ (یونس:۹۸)

ترجمہ: پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونسؑ کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا۔

لَّهُمْ عَذَابٌ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَلَعَذَابُ ٱلْءَاخِرَةِ أَشَقُّ وَمَا لَهُم مِّنَ ٱللَّهِ مِن وَاقٍ ۝ (الرعد:۳۴)

ترجمہ: ایسے لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے کوئی ایسا نہیں جو انہیں اللہ سے بچانے والا ہو۔

وَإِن مِّن قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا كَانَ ذَٰلِكَ فِى ٱلْكِتَٰبِ مَسْطُورًا (الاسراء:۵۸)

ترجمہ: اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں یہ نوشتۂ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

ثَانِیَ عِطْفِهٖ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّنُذِیْقُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِیْقِ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ (الحج:۹-۱۰)

ترجمہ: گردن اکڑائے ہوئے تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں ایسے شخص کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے روز اس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لئے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا ○ (الاحزاب:۵۷)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا ہے۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (الدخان:۱۲)

ترجمہ: پروردگار ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے ہم ایمان لاتے ہیں۔

وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ (الزخرف:۴۸)

ترجمہ: اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ (الزخرف:۵۰)

ترجمہ: مگر جوں ہی ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔

وَلَوْلَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ○ (الحشر:۳)

ترجمہ: اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا، اور آخرت میں تو ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْیَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِیْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِیْنَ (القصص:۵۸)

ترجمہ: اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔

سبحانی صاحب نے جب کہا کہ کفر اور شرک کے خلاف جہاد نہیں ہے، صرف ظلم واستبداد کے خلاف جہاد ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو جو خط لکھا اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟ اَنۡ لَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ۔ میرے خلاف سرکشی نہ کرو مسلمان بن کر میرے پاس آجاؤ۔ "مُسۡلِمِیۡنَ" کے دو معنی لئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ اسلام قبول کر کے آؤ، دوسرے یہ کہ تابعدار بن کر آؤ۔

سبحانی صاحب نے اسی لئے لکھا کہ مسلمین شرعی معنی میں نہیں ہے لغوی معنی میں ہے۔ "مُسۡلِمِیۡنَ" کے چاہے جو معنی بھی لئے جائیں سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے اس لئے کہ کسی ملک کے حکمران کو یہ کہاں حق پہنچتا ہے کہ کسی ملک کے حکمران کو کہے کہ تم میرے تابع ہو جاؤ ورنہ میں تمہیں بزور اپنا تابع بنالوں گا اور تم کچھ نہیں کرسکو گے۔ بہرصورت حضرت سلیمان علیہ السلام نے مُسۡلِمِیۡنَ کا لفظ کس معنی میں استعمال کیا ہے خدا ہی جانتا ہے لیکن ملکۂ سبا نے تو شرعی معنی میں ہی سمجھا اور اسلام قبول کر کے آگئیں۔ بعض مفسرین نے شرعی معنی کو ترجیح دی ہے جلالین کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"مسلمین" ای منقادین لدین اللّٰہ وفی ھذا الخطاب اشعار بانہ رسول من عنداللّٰہ یدعوھم إلی دین اللّٰہ ولیس مطلق سلطان وإلا لقال واتونی طائعین۔

سبحانی صاحب کے خلاف ایک دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے۔ "صلح پر آمادہ سے جہاد نہیں کیا جاتا"، دیکھئے ملکۂ سبا صلح کا صرف ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ عملاً کارروائی کر دی۔ صرف اپنا ایک وفد ہی نہیں بھیجا بلکہ تحفے تحائف بھی بھیجے، تاکہ سامنے والے کا دل نرم ہو جائے اور صلح کی ترغیب ہو جائے۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے نرم ہونے کے بجائے غصہ کا اظہار کیا اور دھمکی دے ڈالی۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيۡمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰٮنِۦَ اللّٰهُ خَيۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِهَدِيَّتِكُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ ۞ اِرۡجِعۡ اِلَيۡهِمۡ فَلَنَاۡتِيَنَّهُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمۡ بِهَا وَلَنُخۡرِجَنَّهُمۡ مِّنۡهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ۞ (النمل: ۳۶-۳۷)

ترجمہ: جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا: کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے، تمہارا ہدیہ تم ہی کو مبارک رہے (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والے کی طرف ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کرسکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے رویہ کی ایک توجیہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب بھی کرتے ہیں اس کو پڑھئے:

''حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرا مطالبہ آپ کی ملکہ اور آپ کی حکومت سے اطاعت کا ہے۔ میں صرف دوستی کا خواہش مند نہیں ہوں کہ ان تحفوں سے خوش ہو جاؤں کہ ہمارے درمیان دوستی اور رسم وراہ قائم ہو گئی۔ مال ومتاع میرے پاس بہت ہے اور وہ بہر شکل آپ لوگوں کے مال سے بہتر ہے، آپ لوگ تو اس طرح کی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں اس لئے کہ آپ لوگوں کی نظر میں ساری قدر انہی چیزوں کی ہے لیکن میرے پیش نظر اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ میرے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ میں تحفوں سے خوش ہو کر شرک وکفر کے اقتدار کو خدا کی زمین پر جائز تسلیم کرلوں۔'' (تدبر قرآن، صفحہ:۶۰۲)

سبحانی صاحب نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے رویہ کو جائز بتانے کے لئے ملکۂ سبا کو ایک ڈکٹیٹر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہد ہد کے قول ''اِمۡرَاَةً تَمۡلِكُهُمۡ'' کو کھینچ تان کر لوگوں کو غلام بنانے کی بات کی ہے حالانکہ ہد ہد کے کلام میں صرف دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہاں ایک عورت بادشاہی کرتی ہے، دوسری یہ کہ وہاں کے لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں، ملکۂ سبا کے ظلم واستبداد کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ ظلم واستبداد کی بناء پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ اقدام کیا اس کی تائید کہاں ہوتی ہے؟ جبکہ حضرت ہد ہد کے علاوہ کوئی ذریعہ علم نہیں تھا۔

ایک طرف امین احسن اصلاحی صاحب کی توجیہ ہے اور دوسری طرف سبحانی صاحب کی توجیہ ہے دونوں میں کتنی جان ہے غور کیجئے۔

سبحانی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ ایک حقیقت ہے جس سے کوئی شریف انسان اختلاف نہیں کرسکتا کہ دنیا کی سب سے بڑی برائی ظلم واستبداد ہے۔ ظلم واستبداد کے علاوہ جتنی برائیاں ہیں وہ سب اسی کی شاخیں اور نسلیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم واستبداد کو کسی بھی صورت میں پسند نہیں کرتا۔ چاہے یہ ظلم واستبداد اہل اسلام پر ہو یا غیر مسلموں پر۔'' (جہاد اور روح جہاد صفحہ:۸۶)

سبحانی صاحب نے جس کو ایک حقیقت بتایا ہے اور جس سے کوئی شریف انسان اختلاف نہیں کرسکتا وہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور کوئی بھی قرآن کا طالب علم پہلی نظر میں ضرور اختلاف کرے گا۔

اس لئے کہ قرآن کی نظر میں سب سے بڑی برائی شرک ہے اور جتنی بھی برائیاں ہیں وہ سب شرک اور کفر کی شاخیں اور نسلیں ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء:۴۸)

ترجمہ: اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ سب سے بڑی برائی شرک ہے اس لئے اس کو نا قابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسی بناء پر "اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" بھی فرمایا گیا ہے۔ ظلم کی چاہے آپ کتنی بھی تقسیم کریں اور اس کی اقسام بتائیں وہ برائی کے اعتبار سے شرک سے بڑا نہیں ہو سکتا۔ جس طرح سب سے بڑی نیکی ایمان ہے اور ساری نیکیاں اور اچھائیاں اس کے تحت آتی ہیں اسی طرح ساری برائیاں شرک کے تحت آتی ہیں۔ یہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس سے صاحب ایمان کے لئے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲۰۱۸ء)

